جل

نگار

قیمت ۸/

تصانیف حضرت نیاز فتحپوری

نگارستان
حضرت نیاز کے بہترین ادبی مقالات اور افسانوں کا مجموعہ۔ نگارستان نے ملک میں جو درجہ قبولیت حاصل کیا اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اس کے متعدد مضامین غیر زبانوں میں منتقل کئے گئے قیمت علاوہ محصول عا

گہوارۂ تمدن
مولانا نیاز کی وہ معرکۃ الآرا کتاب جس میں تاریخ اور اساطیر سے ثابت کیا گیا ہے کہ ارتقاء تمدن میں عورت نے کتنا زبردست حصہ لیا ہے اور دنیائے تہذیب و شائستگی اس کی کس قدر ممنون ہے اردو میں بالکل پہلی کتاب ہے قیمت علاوہ محصول عا

شہاب کی سرگزشت
حضرت نیاز کا وہ عدیم النظیر افسانہ جو اردو زبان میں بالکل پہلی مرتبہ سیرت نگاری کے اصول پر لکھا گیا ہے اس کی زبان اس کی تخیل اس کی نزاکت بیان اس کی بلندی مضمون اور اس کی انشاء عالیہ حد کمال کو پہنچی ہے قیمت علاوہ محصول عہ

فراست الید
مولفہ نیاز فتحپوری جس کے مطالعہ سے ایک شخص آسانی ہاتھ کی شناخت کو اس کی لکیروں کے ذریعہ اپنے یا دوسرے شخص کے مستقبل، سیرت عروج و زوال، دولت و صحت و بیماری وغیرہ کے متعلق صحیح پیشین گوئی کر سکتا ہے قیمت علاوہ محصول عہ

شاعر کا انجام
جناب نیاز کے عنوان شباب کا لکھا ہوا افسانہ جس میں حسن و عشق کی تمام نشاط بخش کیفیات اپنے ایک مستقل جلوہ میں موجود ہیں یہ افسانہ پلاٹ اور انشاء کے لحاظ سے اس قدر بلند چیز ہے کہ دوسری جگہ مل نہیں سکتی قیمت علاوہ محصول ۱۰/

جذبات بھاشا
جناب نیاز نے ایک دلچسپ تمہید کے ساتھ بہترین ہندی شاعری کے نمونے چن کر ان کی ایسی تشریح کی ہے کہ دل بیتاب ہو جاتا ہے اردو میں یہ پہلی کتاب اس موضوع پر لکھی گئی ہے [illegible] قیمت علاوہ محصول

صحابیات
جس میں عہد سعادت کی ۷۰ خواتین کے مستند حالات بیان کر دئے گئے ہیں اس کا مقدمہ مولانا نے خاص اپنی انشاء میں لکھا ہے اس کتاب میں بجز صحابیات کے زیادہ صحابیات کے حالات درج ہیں طباعت و کتابت نہایت نفیس ہے قیمت علاوہ محصول ۱۲/

نقاب اٹھ جانے کے بعد
تین افسانوں کا مجموعہ جس میں بتایا گیا ہے کہ ہر وہ چیز جو چمکتی ہو سونا نہیں۔ زبان و پلاٹ انشاء و تخیل کے لحاظ سے تعریف فضول ہے اور حضرت نیاز کا نام کافی ضمانت ہے قیمت ۵/ علاوہ محصول

مذاکرات نیاز
یعنی حضرت نیاز کی ڈائری جو ادبیات و تنقید عالیہ کا عجیب و غریب ذخیرہ ہے ایک بار اس کو شروع کر دینا آخر تک پڑھ لینا ہے۔ اس کتاب کی بہت کم جلدیں باقی رہ گئی ہیں۔ قیمت ۱۲/ علاوہ محصول

فلاسفۂ قدیم
اس مجموعہ میں حضرت نیاز کے تین علمی مضامین شامل ہیں ۱۔ چند گھنٹے فلاسفۂ قدیم کی روحوں کے ساتھ ۲۔ مادیئین کا مذہب ۳۔ حرکت کے کرشمے نہایت مفید و دلچسپ کتاب ہے قیمت عہ علاوہ محصول

تاریخ الدولتین
جرجی زیدان کے تاریخ تمدن الاسلام کی چوتھی جلد کا ترجمہ جس میں عہد بنی امیہ و بنی عباس کی سیاسیات پر بے مثل تبصرہ کیا گیا ہے۔ جرجی زیدان کی یہ کتاب بین الاقوامی شہرت حاصل کر چکی ہے قیمت عمر علاوہ محصول

المسئلۃ الشرقیہ
مصطفےٰ کامل پاشا کی مشہور عالم کتاب کا ترجمہ یہ وہ کتاب ہے جس نے یورپ و دنیا کے سیاسیات میں ہلچل ڈال دی تھی اور جس نے سب سے پہلے ترکی و مصر عرب و حجاز میں انقلاب کی روح پھونکی قیمت عار علاوہ محصول

دیگر مصنفین کی قابل مطالعہ کتابیں

تذکرۂ خندۂ گل
مولفہ عبد الباری آسی جس میں ۳۰۰ صفحات سے زیادہ اردو فارسی کے ظریف شاعروں کے حالات مع ان کے ادبی نقد و ظرافت و انتخابات کلام کے درج ہیں قیمت مع محصول ۱/۸

مثنوی لالہ رخ
ٹامس مور کی معرکۃ الآراء مثنوی کا مکمل ترجمہ ادبی شاہکار کا بے مثل نمونہ قیمت مع محصول عہ

مثنوی زہر عشق
مرتبہ مجنوں گورکھپوری جس میں ملک کے چار بہترین ادیبوں کا مقدمہ شامل ہے اور کئی تصویریں دی گئی ہیں ایک تصویر رنگین ہے۔ ۸/

فراست التحریر مکمل
یعنی اردو و دیگر زبان کی تحریر خط اور انداز تحریر دیکھ کر ایک شخص کی سیرت چال چلن مستقبل اور تمام حالات معلوم کرنے کا فن اردو میں بالکل پہلی کتاب قیمت ۸/ علاوہ محصول۔

نگار

رسالہ ہر مہینے کی ۱۵ تاریخ تک شائع ہوتا ہے

رسالہ نہ پہونچنے کی صورت میں ۲۵ تاریخ تک دفتر میں اطلاع ہونی چاہیئے ورنہ رسالہ مفت نہ روانہ ہوگا

سالانہ قیمت پانچ روپیہ (صہ) ششماہی تین روپیہ (ے)

بیرون ہند سے آٹھ روپیہ سالانہ پیشگی مقرر ہے

جلد ۲۵	فہرست مضامین جون سنہ ۱۹۳۴ء	شمارہ ۶

ملاحظات ———— ۲
فلسفہ کی تعلیم اور اس کی اہمیت ———— میر ولی الدین ایم اے۔ پی ایچ ڈی (لنڈن) معلم فلسفہ کلیہ جامعہ عثمانیہ (حیدرآباد) ۹
رجونتی ———— احتشام رضوی ———— ۲۹
انسان کی لازوال عظمت ———— عبدالحفیظ ———— ۳۷
مکتوبات نیاز ———— ۴۶
بیراگ کا بروگ ———— ۵۱
میکدۂ اسلام ———— ۵۷
باب الانتقاد ———— ۶۲
باب المراسلۃ والمناظرہ ———— ۶۷
باب الاستفسار ———— ۷۰
لکھنؤ کی شاعری ———— ہوش ———— ۷۲
کلام اختر ———— اختر ———— ۷۶
اشک بیتاب ———— شیدا ———— ۷۷
صداے۔ مطالبات ———— بنی احمد۔ کوکب ———— ۷۸

نگار

اڈیٹر :- نیاز فتحپوری

جلد ۲۵	جون ۱۹۴۲ء	شمارہ ۶

ملاحظات

خدا نے دنیا کو کیوں پیدا کیا

یہ ایک سوال ہے جو ایک ہندو سوسائٹی نے مجھ سے کیا ہے ؟

یہ سوال خالص مذہبی ہے ، یعنی یہ جستجو اسی شخص میں پیدا ہو سکتی ہے جو خدا کے وجود کا قایل ہے اور اس شعور کا پایا جانا تسلیم کر چکا ہے ، لیکن جو منکرِ خدا ہے وہ کون اور کس نے سے گفتگو نہیں کرتا ، بلکہ اس کی تلاش یہ ہوتی ہے کہ یہ عالم کیونکر ظہور میں آیا۔ اور اس کے اندر انسان کی حیثیت کیا ہے ؟

ایک پابندِ مذہب انسان چونکہ خدا کو بالکل اسی طرح کا صناع و خلاق مانتا ہے جس طرح ایک کمہار یا بڑھئی کہ جو برتن اسکے جی میں آیا بنا دیا ، جسطرح کی چوکی چاہی اسنے طیار کر دی ، اسلئے اصولاً اس کے سامنے کیونکر کا سوال نہیں آسکتا ، کیونکہ ایک قادرِ مطلق اور مختارِ کل ہستی کو ہر وقت قدرت و اختیار حاصل ہے کہ جب چاہے ، بغیر کسی ذریعہ و سبب کے اپنے ارادہ سے ہیژدہ ہزار عالم پیدا کر دے اور جب اس کے جی میں آئے آناً فاناً محو کر دے ۔ لیکن ایک منکر چونکہ دنیا کی پیدایش کو کسی ہستی کے ارادہ سے

متعلق نہیں سمجھتا بلکہ اس کو مخصوص اسباب سے وابستہ جانتا ہے اور تدریجی ارتقاء کا قایل ہے اس لئے لامحالہ اُسے غور کرنا چاہئے کہ اصولِ آفرینش کیا ہیں اور کن اسباب کے ماتحت کائنات نے موجودہ شکل اختیار کی ہے

بہرحال اس باب میں ایک مذہبی انسان کا نقطۂ نظر، مُنکر کے نقطۂ نظر سے بالکل علیحدہ ہے اور اس لئے اگر مندرجۂ عنوان سوال دونوں کے سامنے پیش کیا جائے تو ظاہر ہے کہ دونوں کا جواب بالکل ایک دوسرے سے مختلف ہوگا۔ لیکن گفتگو اس میں ہے کہ کیا واقعی دونوں اس سوال کا جواب دینے کے اہل ہیں۔ ایک مذہبی شخص جو پیدائش عالم کے لئے کسی علت و سبب کے وجود کو ضروری نہیں سمجھتا وہ نتیجہ و غایت پر غور کرنے کا مستحق کیونکر قرار دیا جاسکتا ہے۔ یعنی جب اس نے یہ تسلیم کرلیا کہ خدا قادرِ مطلق ہے، اس سے کوئی سوال نہیں کیا جا سکتا، وہ جو چاہے پیدا کردے اور جب چاہے فنا کردے، تو پھر کیوں کا سوال کیسا، یہ "چون و چرا" تو اسباب و علل سے متعلق ہوا کرتا ہے اور جب وہاں سرے سے اسی کا انکار کیا جاتا ہے تو استفسار کیوں؟ - البتہ ایک منکر کے متعلق خیال ہوسکتا ہے کہ اس نے اس پر غور کیا ہوگا، لیکن اگر انصاف سے پوچھئے تو یہ کہنا پڑے گا "کیوں" کا جواب نہ خدا کا اقرار کرنے والا دے سکتا ہے، نہ انکار کرنے والا، کیونکہ جس طرح مذہب آج تک غایتِ آفرینش کو نہیں سمجھ سکا، اسی طرح سائنس بھی اس معمہ کو حل نہیں کرسکی، یعنی اگر ایک پابند مذہب شخص یہ نہیں بتا سکتا کہ کائنات کے پیدا کرنے سے خدا کا کیا مقصود ہے تو بڑے سے بڑا سائنس داں بھی نہیں کہہ سکتا کہ مادہ و قوت کے اس ہیجان کا نتیجہ کیا ہونا ہے۔ لیکن کس قدر حیرتناک امر ہے کہ باوجود اس نااہلی کے دونوں اس کا جواب دینے کی کوشش کرتے ہیں اور ان میں سے ہر ایک اصرار کرتا ہے کہ وہی حق پر ہے، درانحالیکہ ان میں سے کسی کے پاس کوئی ادنیٰ دلیل بھی اس دعوے کے لئے موجود نہیں —— اہل مذاہب میں ایک جماعت تو علما ظواہر کی ہے جو اپنے آپ کو مخصوص شریعت کا پابند کہتے ہیں اور جو مذہب کو صرف اُن کتابوں سے سمجھنا چاہتے ہیں جو ان کے اسلاف لکھ گئے ہیں اور جن کی بنا پر سوسائٹی کا.... نظام مقرر کیا گیا تھا، دوسری جماعت اہل تصوف کی ہے جنھوں نے اپنے مسلک کا نام شریعت نہیں بلکہ طریقت رکھا ہے اور جو تمام مسائل کو روحانیت سے سمجھنا اور سمجھانا چاہتے ہیں —— مسلمانوں میں اوّل الذکر جماعت کے پاس اس سوال کا کھلا ہوا جواب موجود ہے اور اُن کو زیادہ سوچنے کی ضرورت نہیں، کیونکہ قرآن نے کھلے ہوئے الفاظ میں اس سوال کا جواب ان الفاظ میں دیا ہے کہ "ماخلقت الانس والجن الا لیعبدون" یعنی ہم نے انسان و جنات کو صرف اس لئے پیدا کیا ہے کہ وہ عبادت کریں۔ اس لئے اگر آج عبادت کی کیفیت و ہیئت متعین ہوجائے تو ایک مسلمان کے پاس اس سوال کا جواب دینا مشکل نہیں —— عام طور پر عبادت کا مفہوم نہ صرف اسلام بلکہ تمام دیگر مذاہب میں وہی ہے جسے پوجا یا پرستش سے ظاہر کیا جاتا ہے، لیکن چونکہ دنیا میں کوئی فعل ارادہ و نتیجہ سے بے نیاز نہیں ہوسکتا، اس لئے ہر شخص کا (خواہ وہ کسی مذہب سے متعلق ہو) فطری حق ہے کہ وہ ان دونوں باتوں پر غور کرے۔ یعنی ایک یہ کہ وہ کس ارادہ و نیت سے خدا کی پوجا کرتا ہے اور دوسرے یہ کہ جو غرض و غایت اس نے

سمجھ رکھی ہے وہ عبادت سے کس حد تک پوری ہوتی ہے ـــــــ مذہبی اقوام میں بلا استثنا، کوئی قوم ایسی نہیں ہے جو اس ارادہ و نیت سے عبادت نہ کرتی ہو کہ اس سے خدا خوش ہوگا اور وہ ہماری مشکلات کو دُور کرے گا، پھر اگر واقعی کبھی کسی کے مصائب دور ہو جاتے ہیں تو وہ اسکو اسی عبادت کا نتیجہ خیال کرتا ہے اور اگر ایسا نہیں ہوتا تو وہ اپنے آپ پر الزام قائم کرتا ہے کہ جو حق عبادت کرنے کا تھا وہ ادا نہ ہوا اور خدا کی خوشنودی حاصل نہ ہو سکی ـــــــ اس میں کلام نہیں کہ جس حد تک انسان کے جذبات و تاثرات کا تعلق ہے اس خیال سے اس کو کافی تسکین ہو جاتی ہے اور وہ مایوسی کا مقابلہ آسانی سے کر سکتا ہے، لیکن جب جذبات کی دنیا سے علیحدہ ہو کر سوال صرف علمی تحقیق کا ہوتا ہے یا کسی ایسے شخص کی تسکین کا ہوتا ہے جو کسی معلول کا وجود بغیر علت کے ماننے کے لئے طیار نہیں، تو لامحالہ غور کرنا پڑتا ہے کہ عبادت سے خدا کا خوش ہونا کیا معنی رکھ سکتا ہے۔ اور خدا کی خوشی یا رضامندی کا ہمارے دُنیاوی حالات و اسباب سے کیا تعلق ہے ـــــــ اس سلسلہ میں سب سے پہلے "حقیقتِ خدا" کا مسئلہ آتا ہے یعنی یہ کہ جب تک ہم کو پہلے یہ نہ معلوم ہو جائے کہ خدا کیا ہے، اسکے وجود کی حقیقت کیا ہے، اس وقت تک نہ ہم عبادت کی کوئی علمی توجیہہ کر سکتے ہیں اور نہ اس سے کسی نتیجہ کے پیدا ہونے پر حکم لگا سکتے ہیں ـــــــ خدا کے متعلق انسان کا اولین تصور بالکل وہی ہے جو دنیا کے کسی مستبد بادشاہ و حکمران کے متعلق ہو سکتا ہے یعنی خوشامد و تملق سے خوش ہونا، تحائف و نذرانہ قبول کر کے نظر التفات صرف کرنا، اور سرتابی و نافرمانی سے غضب آلود ہو کر سزائیں دینا، اس میں شک نہیں کہ رفتہ رفتہ نفس خدا کی ماہیت و حقیقت پر بعض مذاہب کے خیالات زیادہ بلند و لطیف ہو گئے ہیں لیکن جس حد تک پرستش کا تعلق ہے، خدا کی ہستی اب بھی وہی خوش یا ناخوش ہو جانے والی بتائی جاتی ہے اور اپنے بندوں کو سزا یا انعام دینے سے بدستور وہی دلچسپی اس کو باقی ہے

ایک طرف تو یہ بتایا جاتا ہے کہ خدا زمان و مکان سے علیحدہ، احساس و تاثیر سے بیگانہ، اور بے نیاز مطلق ہے، اور دوسری طرف یہ بھی کہا جاتا ہے کہ وہ برہمی و خوشنودی کا محل ہے۔ اور انعام و انتقام کا جذبہ اسکے اندر پایا جاتا ہے۔ میں نہیں سمجھ سکتا کہ ایک ہی وقت میں خدا کو دو متضاد صفات کے ساتھ متصف کرنا کیونکر ممکن ہے۔ اور اس کی خوشنودی یا برہمی کیا معنی رکھ سکتی ہے، جبکہ وہ خود نہ کسی چیز سے متاثر ہوتا ہے اور نہ اُسے پوجا یا پرستش کی ضرورت ہے ـــــــ بعض اہل مذاہب کہتے ہیں کہ عبادت سے خدا کو خوش کرنے کا مفہوم صرف یہ ہے کہ خود عبادت کرنیوالا اس سے فائدہ اٹھائے، یعنی خدا کی پرستش کا مقصود خود اپنی اصلاح ہے۔ بالکل درست لیکن یہاں یہ امر غور طلب ہے کہ عبادت سے جو اپنی اصلاح وابستہ ہے وہ ہمارے اعمال و افعال سے بھی کوئی تعلق رکھتی ہے یا نہیں، یعنی محض ہمارا عبادت کر لینا کافی ہے یا اسی کے ساتھ اپنی زندگی میں بھی تبدیلی پیدا کرنے کی ضرورت ہوتی ہے ؟

ظاہر ہے کہ محض عبادت خواہ وہ کسی صورت میں ہو بیکار ہے اگر وہ ہمارے اخلاق و اعمال پر اثر انداز نہیں ہوتی اس لئے نتیجہ یہ نکلا کہ عبادت کا مدعا اپنے اندر تبدیلی پیدا کرنا ہے اور اسی کو خدا کی خوشنودی سے تعبیر کیا گیا تاکہ لوگوں کو اس طرف توجہ ہو اور وہ اسے ترک نہ کر بیٹھیں ـــــــ بظاہر یہ بیان بہت قرین عقل و صواب معلوم ہوتا ہے لیکن اگر غور کیجئے تو معلوم ہوگا۔ کہ انسان کی گمراہی و شقاوت کا بڑا سبب یہی ہے ـــــــ چونکہ اہل مذاہب نے ہمیشہ یہی لوگوں کو سمجھایا کہ خدا

عبادت سے خوش ہوتا ہے اور خدا کی خوشنودی ہی حاصل کرنا عین مدعا ہے، اس لئے یہ بات کبھی اُن کے ذہن میں نہ آئی کہ عبادت کا تعلق خود اپنی اصلاح اعمال سے ہے اور اگر ہم اپنی زندگی میں کوئی تغیر نہ پیدا کریں تو عبادت بیکار ہے ـــــ اس کا نتیجہ ایک طرف تو یہ ہوا کہ عبادت نام قرار دیا گیا صرف چند مخصوص حرکات و مراسم کا۔ اور دوسری طرف لوگوں کے اخلاق پر یہ خراب اثر پڑا کہ خدا کو عبادت سے خوش رکھنے کے اعتماد پر وہ دنیاوی معاملات میں ہر قسم کی بے عنوانی پر آمادہ ہو گئے اور اخوت و ہمدردی کا جذبہ جو نظام تمدن کی جان ہے ان کے اندر ضعیف ہونے لگا

اگر ابتدا ہی سے اس امر پر زور دیا جاتا کہ خدا تمھاری عبادت سے خوش نہیں ہوتا بلکہ تمھاری اصلاح و ترقی سے خوش ہوتا ہے اور عبادت کا مدعا بھی یہی ہے تو شاید دنیا کی حالت آج دوسری ہوتی ـــــ ہر چند بعض مذاہب نے عبادت کی ماہیت و غایت بیان کرتے ہوئے اس حقیقت کا اعلان بار بار کیا ہے، لیکن چونکہ عبادت پرستش میں حیات بعد الموت کی راحت کا خیال بھی شامل کر دیا گیا ہے اس لئے اس دنیاوی زندگی میں اس کا نتیجہ خاطر خواہ برآمد نہیں ہوتا اور عام طور پر لوگ یہ سمجھے بیٹھے ہیں کہ اصل زندگی تو مرنے کے بعد ہی شروع ہوگی اور چونکہ اسکے متعلق عبادت کے بعد اطمینان ہو ہی گیا ہے اس لئے اس دوروزہ زندگی کی اصلاح میں کیا سر کھپایا جائے ـــــ میری رائے میں مذاہب کی سب سے زیادہ خطرناک تعلیم یہی ہے کہ دنیا فانی ہے، انسان فانی ہے اور بقا اس زندگی کو حاصل ہے جو مرنے کے بعد شروع ہوگی اور اسی کو سنوارنے کی ضرورت ہے۔ گویا انسانوں کا یہ اجتماع سرائے کے مسافروں کا اجتماع ہے جسے صبح یا شام منتشر ہو جانا ہے، پھر ظاہر ہے کہ جب تعلیم یہ ہوگی تو باہمدگر کیا ہمدردی پیدا ہو سکتی ہے اور دنیاوی زندگی کی ترقی و اصلاح کے لئے کون سا جذبہ کام کر سکتا ہے ـــــ مسلمانوں میں نماز کا طریق عبادت اس میں شک نہیں کہ بڑی حد تک اجتماعی کیفیت لئے ہوئے ہے، لیکن چونکہ وہاں بھی وہی آخرت و معاد کا خیال ساتھ ساتھ ہوتا ہے، اس لئے اگر مسلمان یکجا جمع ہوتے ہیں تو صرف انفرادی طور پر اپنی اپنی عاقبت سنوارنے کے لئے اور اجتماعی زندگی کی اصلاح و ترقی کا کوئی سوال ان کے سامنے نہیں ہوتا ـــــ چنانچہ آپ کسی بڑی سی بڑی مسجد کا اجتماع جا کر دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ بہت سے جانور کسی احاطہ کے اندر جمع کر دیئے گئے ہیں۔ اور ایک ہی صف میں پاس پاس بیٹھنے والوں کو بھی ایک دوسرے کے درد دُکھ کی خبر نہیں ہے ـــــ اگر مسجدوں کا یہ اجتماع، بجائے روزانہ پانچ مرتبہ کے ہفتہ میں صرف ایک ہی بار ہو اور سجدہ و رکوع کی جگہ وہ آپس میں بیٹھ کر تبادلۂ خیال کریں، اور اپنے اپنے محلہ کے بچوں کی تعلیم، بیواؤں کی پرورش، ضعیفوں اور بیماروں کی نگرانی مفلسوں اور ناداروں کی امداد، جماعتی تنظیم، اقتصادی مشکلات، اور سیاسی مسائل پر گفتگو کر کے لائحہ عمل بھی طیار کرتے رہیں تو کتنا عظیم فائدہ مترتب ہو سکتا ہے ـــــ ایک وقت تھا کہ مسلمانوں کی مسجدیں ان کے دار الاجتماع تھے، جہاں قوم کے تمام معاملات پر گفتگو ہوتی تھی، لیکن آج مولوی کہتا ہے کہ مسجد میں بیٹھ کر کوئی بات دنیا کی نہ کرو۔ یعنی صرف اُس دنیا کی بات کرو جس کا علم تمھیں تو نہیں ہے لیکن اُس مولوی کو ضرور ہے جو خدا کے "خلوتیان راز" میں سے ہے اور جس کے ہاتھ میں ہے خواہ تم کو جہنم میں ڈال دے یا فردوس بریں میں بھیجدے ـــــ علماء ظواہر کے مفہوم عبادت نے جو مذموم صورت اختیار کی اس کا حال

تو آپ کو اس بیان سے واضح ہو گیا ہو گا، اب رہ گئے اہل باطن جو بجائے شریعت کے طریقت پر کاربند ہیں، سو اس میں شک نہیں کہ جس حد تک خدا کے تصور کا تعلق تھا وہ زیادہ کامیاب ثابت ہوئے اور انھوں نے عقیدۂ "ہمہ اوست" سے "خدا" کی تعبیر بڑی حد تک قابل قبول صورت میں پیش کی، لیکن عبادت کے مسئلہ کو وہ بھی نہ حل کر سکے اور چونکہ معاد و آخرت کی زندگی اُن کے یہاں بھی اصل چیز تھی اس لئے باوجود گانے بجانے کا شوق رکھنے کے بھی وہ عبادت کے مسئلہ میں علمائے ظواہر کی پابندیوں سے علٰحدہ نہ ہو سکے اور شریعت کے مقابلہ میں انکی طریقت اپنا کوئی مستقل ادارہ جداگانہ قائم نہ کر سکی —— الغرض مسلمانوں کی طرف سے اس سوال کا یہ جواب دینا کہ خدا نے انس و جن کو اس لئے پیدا کیا کہ وہ اس کی عبادت کریں، عام متبادر معنی کے لحاظ سے نوع انسانی کے لئے مفید ثابت نہیں ہوا —— دنیا میں ترقی یافتہ مذاہب دو طرح کے ہیں، ایک وہ جنھوں نے زندگی یا مذہب کا کوئی فلسفہ پیش کیا اور دوسرے وہ جنھوں نے صرف عملی زندگی کو سامنے رکھ کر چند اصول سوسائٹی کے مرتب کرنے پر اکتفا کی ہر چند اول الذکر مذاہب کی تعلیم کا بھی حقیقی مقصود وہی سوسائٹی کی اصلاح تھا لیکن جس طرح براہ راست عملی زندگی کا درس دینے والے مذاہب حیات بعد الموت کے قایل ہو کر مراسم و شعائر میں الجھ کر رہ گئے، اسی طرح فلسفہ پیش کرنے والے مذاہب بھی نفسیاتی گتھیوں کے سلجھانے میں محو ہو کر ایسے دُور از کار قیاسات میں مبتلا ہو گئے کہ سوسائٹی کا مفاد نظر انداز ہو گیا اور ان کی فلسفیانہ عقل آرائیاں، مادی حقیقتوں سے فائدہ اٹھانے کا کوئی لائحۂ عمل بنی نوع انسان کے سامنے پیش نہ کر سکیں —— اگر تھوڑی دیر کے لئے مان لیا جائے کہ مذہب کا تعلق کسی قومی عروج و ارتقا سے نہیں ہے جس کیلئے تیغ و تفنگ کا جارحانہ یہ مدافعانہ استعمال ضروری ہو، بلکہ صرف فلسفۂ حیات پر غور کرنے اور خاموشی سے رموزِ زندگی حل کرنے سے ہے، تو بتائیے کہ ہندوؤں کے فلسفۂ 'ویدانت'، 'نروان'، 'اہمسا' اور 'مکتی' نے دنیا کو کیا فائدہ پہونچایا - یعنی اگر تلوار ہاتھ میں لیکر دنیاوی جاہ و حشم کو اپنے لئے مخصوص کر لینے سے دنیا کو نقصان پہونچا تو بودھ کی طرح کاسۂ گدائی لیکر در در کی بھیک مانگنے سے نوع انسانی کو کیا نجات حاصل ہوئی —— اگر کسی قوم نے اُسے تلوار سے مجروح کیا تو دوسری نے اُسے اپاہج بنایا، اگر ایک نے نفس پرستی و خود غرضی کو رواج دیا تو دوسری نے نفس مدعا و غرض مشترک کو محو کر کے انسانی عزائم کو سرد کر دینے میں کوئی دقیقہ کوشش کا نہ اٹھا رکھا —— الغرض نوع انسانی کو نہ ان مذاہب سے کوئی فائدہ پہونچا جو یکسر عمل ہونے کے مدعی ہیں اور نہ اُن مذاہب سے جو صرف فلسفہ پیش کرنا منتہائے نظر سمجھتے ہیں —— غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا بڑا سبب مسئلۂ "روحانیت" یا "مابعد الطبیعت" ہے جس نے انسان کی دنیاوی زندگی کو بالکل پس پشت ڈالدیا اور حقیقی زندگی کو اس عالم سے متعلق ہی نہ رکھا - اگر یہاں کی زندگی کو اہمیت دی جاتی تو اس کی اصلاح کی طرف توجہ بھی کی جاتی لیکن چونکہ بلا استثنا، تمام مذاہب نے مادی حیات کی تخفیف کی اور اسکو ناقابل اعتنا سمجھا، اس لئے اصولاً کوئی مذہب دنیاوی لحاظ سے کامیاب نہ ہوا اور انسان کے نفسیاتی میلانات نے جو ہنگامہ یہاں برپا کر رکھا ہے اس کا کوئی علاج کسی کی سمجھ میں نہ آیا یہی تلخ تجربہ تھا جس نے دنیا میں مادہ پرست جماعت پیدا کر دی اور دُنیا کو دنیا کے اصول سے سمجھنے اور کاربند ہونے پر مجبور کر دیا —— پھر ہر چند ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ مادئین نے جو کچھ سمجھا وہ بالکل درست ہے یا اُن کے مقرر کئے ہوئے اصول

دنیا کے امن و نجات کے ضامن ہو سکتے ہیں، لیکن اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ ان کا مقصود بالکل برمحل ہے اور قضیہ زمیں برسرِ زمین کے اصول پر کاربند ہونے سے وہ انسانی دماغ کی بہت سی تشویشوں کو دُور کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں اُن کے سامنے نہ ایسے خدا کا سوال ہے جس نے قادرِ مطلق اور فعال لما یرید ہونے کی حیثیت سے انسان کو دنیا میں عضو بیکار بنا رکھا ہے اور نہ وہ اپنا وقت اس مسئلہ پر غور کرنے میں ضائع کرتے ہیں کہ دنیا کیوں پیدا کی گئی —— وہ صرف یہ دیکھتے ہیں کہ دنیا پیدا ہو چکی ہے، اور اسی میں ہم کو زندگی بسر کرنا ہے، اس کے بعد کچھ نہیں ہے اس لئے ہمکو ہر ممکن کوشش کے ساتھ اس سے فائدہ اٹھانا چاہیئے۔ اور ترقی کی جتنی راہیں ہیں ان پر چل کر دنیا کو اپنے لئے جنت بنا لینا چاہیئے

اس میں شک نہیں کہ یہ مادی تحریک اخلاق کی ضامن نہیں ہے، اور اس سے خود غرضی کا جذبہ قوی ہو کر ایک قوم کا دوسری قوم کو ہلاک کر دینا مستبعد نہیں، لیکن اگر صرف اسی دلیل پر اس تحریک کو رد کر دیا جائے تو کوئی وجہ نہیں کہ مذہب کی حمایت کی جائے جبکہ اس نے بھی یہی کیا اور اس کے ہاتھ بھی ہمیشہ خون سے رنگین نظر آئے۔ فرق اگر ہے تو صرف یہ کہ ایک نے خدا کا نام لیکر تلوار اٹھائی اور دوسرا خدا کو بدنام نہیں کرتا اور اپنی ہی اغراض کو اس کا ذمہ دار قرار دیتا ہے

علاوہ اس کے ایک مسئلہ اور اس جگہ قابلِ غور ہے، وہ یہ کہ مادیین کا مذہب ہنوز ارتقاء کی حالت میں ہے اور بالکل ممکن ہے کہ آیندہ کوئی صورت ایسی پیش آئے کہ انسان خونریزی سے باز رہنے پر مجبور ہو جائے —— بحالتِ موجودہ نظامِ تمدن نے جو ہمیشہ مادی ترقی پر قایم ہے، وسیع ہو کر ایسی عجیب و غریب صورت اختیار کر لی ہے کہ آہستہ آہستہ تمام قومیں، تمام جماعتیں بلکہ جملہ افراد ایک دوسرے سے وابستہ ہوتے جاتے ہیں، یعنی اغراض کی تکمیل روز بروز باہمی تعاون پر منحصر ہوتی جا رہی ہے، پھر کیا یہ امر خلافِ عقل ہے کہ ایک وقت ایسا آئے جب باہمی تصادم کی تمام صورتیں مسدود ہو جائیں اور تمام نوعِ انسانی ایک نظام سے وابستہ ہو کر ایک قوم، ایک جماعت، ایک ہیئت اور ایک تشکیل میں بدل جائیں یہانتک باہمی جنگ و خونریزی کا امکان ہی باقی نہ رہے —— اس وقت جس چیز نے دنیا میں ہنگامہ برپا کر رکھا ہے وہ سرمایہ داری اور اشتراکیت کی جنگ ہے، یعنی دنیا اب اس کو برداشت نہیں کر سکتی کہ انسان انسان میں تفریق صرف اس بنا پر قایم ہے کہ ایک کے پاس دولت کا انبار ہے اور دوسرا اس سے محروم ہے۔ دولت انسان ہی کی پیدا کی ہوئی ایک مفروضہ قوت ہے جس سے اسوقت تک کام لیا جا سکتا ہے، جب تک سب یکساں طور پر اس سے مستفید ہوتے رہیں، لیکن اگر یہ مساوات مفقود ہو جائے اور دولت انسانیت کو پامال کرنے میں صرف ہونے لگے تو اس کو مٹ جانا چاہیئے۔ چنانچہ آپ دیکھیں گے کہ اس وقت یورپ کا ہر ملک اس جذبہ سے متاثر ہو رہا ہے اور تمام وہ حکومتیں جو سرمایہ دارانہ استبداد و استعمار پر قائم تھیں ایک ایک کرکے اشتراکی اصول پر کاربند ہونے کے لئے مجبور ہو رہی ہیں پھر اگر ساری دنیا میں اشتراکیت پھیل جائے اور دولتمندی و افلاس کا مفہوم ہی بالکل بدل جائے تو کیا آپ سمجھ سکتے ہیں کہ اس وقت بھی ایک انسان........ دوسرے انسان سے اور ایک جماعت دوسری جماعت سے برسرِ پیکار ہوگی ؟ ہرگز نہیں۔ کیونکہ سارا اختلاف تو اسی وجہ سے پیدا ہوتا ہے کہ

فلاں سرمایہ دار ہے اور فلاں تہی دست لیکن اگر یہ اختلاف مٹ کر تمام انسان ایک سطح پر آ جائیں تو مخالفت کی کوئی وجہ باقی نہیں رہتی اور دنیا اس امن و سکون کو حاصل کر سکتی ہے جسے مذاہب عالم اس وقت تک حاصل نہیں کر سکے

اس لئے بہ حالات موجودہ ہمارا یہ سوچنا کہ خدا نے کائنات کو کیوں پیدا کیا، صد درجہ تضیع اوقات ہے، سوچنے کی بات صرف یہ ہے کہ جب ہم اس دنیا میں آ گئے ہیں تو ہم کو زندگی کیونکر بسر کرنا چاہئے اور اپنا وقت کس طرح صرف کرنا چاہئے

خدا کی حقیقت کیا ہے، دنیا سے اس کا کیا تعلق ہے، اس تعلق کی بناء پر ہم کیا کر سکتے ہیں۔ اور کیا نہیں، یہ سب ایسے دُور از کار سوالات ہیں کہ نہ اس وقت تک ان کا کوئی شافی جواب دیا جا چکا ہے اور نہ آئندہ ممکن ہے —— انسان واقعات و حوادث کا بندہ ہے، اسباب و علل کی دنیا میں زندگی بسر کرنے پر مجبور ہے، اس لئے اُسے انھیں باتوں پر غور کرنا چاہئے جن سے اُس کی زندگی متعلق ہے —— اگر خدا دنیا میں آ کر ہمارے کاموں میں ہمارا ہاتھ نہیں بٹاتا تو ہم کو کیا حق حاصل ہے کہ اس کے متعلق گفتگو کر کے اپنا وقت ضائع کرتے رہیں، اگر اُس نے کنُ کہہ کر دفعتہً عالم کو پیدا کر دیا تو کیا، اور تدریجی ارتقار کے ساتھ عالم کو سنوارا تو کیا —— انسان کے درد دُکھ کا علاج ان میں سے کسی اعتقاد سے متعلق نہیں —— پھانس اگر چبھی ہے تو اس کی تکلیف اس کے نکالنے ہی سے دُور ہو سکتی ہے نہ کہ اس بات پر غور کرنے سے کہ پھانس کی حقیقت کیا ہے اور وہ کیونکر گوشت کے اندر پہونچ گئی

—— گھر میں جس وقت آگ لگتی ہے تو اس کا سبب دریافت کرنے سے پہلے اس کے بجھانے کی فکر ہوتی ہے

اس لئے وہ لوگ جو حقیقی معنی میں نوعِ انسانی کے خیر خواہ ہیں، ان کو نہ خدا کی حقیقت پر غور کرنے کی ضرورت ہے اور نہ یہ سوچنے کی کہ اس نے دنیا کو کیوں پیدا کیا، بلکہ صرف ان تدابیر پر غور کرنے کی کہ تمام انسان باہم مل کر صلح و آشتی کی زندگی کیونکر بسر کر سکتے ہیں

مذاہب عالم تو اس تجربہ میں ناکام رہے، اس لئے لامحالہ ہمیں اُن سے ہٹ کر کوئی دوسری راہ اختیار کرنا پڑے گی، خواہ وہ اشتراکیت ہو یا کچھ اور —— پھر اب دیکھنے کی بات صرف یہ ہے کہ زمانہ کا رُخ کیا ہے، سیلاب کا بہاؤ کس طرف ہے۔ اگر ہم نے اس کا ساتھ دیا تو بیشک ہم کو نجات حاصل ہو سکتی ہے۔ ورنہ خس و خاشاک کی طرح بہ جانا یقینی ہے اور مذاہب کا تنکا ہماری کوئی مدد نہیں کر سکتا ——

نگار کی خریداری جاری رکھئے

تاکہ جنوری ۳۵ء کا نگار جو دنیائے صحافت میں بالکل پہلی چیز ہوگا آپ کو مفت حاصل ہو سکے —— جنوری ۳۵ء کا نگار کیسا ہوگا اس کے لئے اس ماہ کے رسالہ کا صفحہ ۷۹، ۸۰ ملاحظہ فرمائیے

منیجر نگار لکھنؤ

فلسفہ کی تعلیم اور اس کی اہمیت

فلسفہ ؟ وہی تجریدات کا گورکھ دھندہ ؟ وہی لم ولانسلم کا دعویٰ ؟ وہی اثیری تخیلات جو منت کش معنی نہیں ؟ الجھن شاید سب ہی کو پیدا ہوتی ہے کہ آخر فلسفہ صرف بحث و مباحثہ ہی کا نام ہے جہاں بحث صرف بحث ہی کی خاطر کیجاتی ہے یا اس بحث کا کوئی موضوع بھی ہوتا ہے جو واضح، صریح، متعین ہو ؟ سب جانتے ہیں کہ علم ہیئت میں اجرام سماوی سے بحث کی جاتی ہے تو ارضیات میں زمین اور چٹانوں سے، نفسیات کا موضوع ذہن یا نفس ہے جہاں احساس ارادہ اور عقل کی ماہیت پر غور کیا جاتا ہے، خود شناسی کے حکیمانہ ہدایت پر عمل کرتے ہوئے ہم پوچھتے ہیں کہ جذبات کا زور مرد افگن کیوں ہوتا ہے، عقل ان کے شر و شور پر کہاں تک غالب ہو سکتی ہے، شعور کے کیا معنی ہیں، تسلسل ذات سے کیا مراد وغیرہ وغیرہ۔ بہر حال یہ تمام علوم واقعات کے ایک متعین دائرہ سے بحث کرتے ہیں، یہ واقعات نہایت اہم و دلچسپ ہیں، علمی و عملی لحاظ سے ان کا فائدہ مسلم ہے۔ لیکن فلسفہ میں کس چیز سے بحث ہوتی ہے، اس کا مبحوث عنہ کیا ہے ؟ استدلالیوں کی یہ چناں و چنیں، یہ لم و نسلم آخر کس چیز کے متعلق ہے ؟ کیا ہم نے نہیں سنا کہ

پائے استدلالیاں چوبیں بود
پائے چوبیں سخت بے تمکیں بود؟

سوال بالکل جائز ہے اور ہمیں ابتدا ہی میں اس کے جواب کی کوشش کرنا ضروری ہے۔ آپ سچ بتلائیے کہ آپ میں سے کوئی ایسا بھی ہے جو زمین اور چٹانوں، اجرام سماوی اور اعمال ذہنی اور دوسرے مخصوص و متعین حالات کے مطالعہ سے کبھی نہ کبھی بیزار یا پریشان نہ ہو گیا ہو اور یہ کہتے ہوئے کہ جح صد کتاب و صد ورق در نار کن۔ یہ نہ پوچھا ہو کہ آخر یہ سب کچھ کاہے کے لئے ؟

اس جھگڑے کا انجام ؟ اس کی قدر و قیمت ؟ اس کے معنی و مقصود ؟ پس فائدہ در جہاں بیفائدہ چیست ؟

جب آپ اس محدود دنیا کے مخصوص و متعین واقعات سے پریشان ہو کر خود دنیا کے معنی و مقصود، اس کی قدر و قیمت و اہمیت اور فرد و عالم کے تعلق کے بارے میں سوال کرتے ہیں تو آپ اسی بدعت کے مرتکب ہوتے ہیں جس کے ارتکاب پر آپ فلسفیوں کو "آوارۂ و مجنوں رسوا سر بازار" قرار دیتے تھے۔

براؤننگ کہا کرتا تھا کہ زندگی کچھ معنی رکھتی ہے اور اسی معنی کا دریافت کرنا میری غذا، میرا اکل وشرب ہے۔ براؤننگ فلسفی تھا۔ فلسفہ کی یہی تعریف ہے کہ یہ "معانی اور قیمتوں کا مطالعہ ہے" یہ حیات کی توجیہ وتعبیر" ہے

فلسفی حیات من حیث کل کا تابت قدمی کے ساتھ مطالعہ کرتا ہے، اس کا نقطہ نگاہ وسیع ہوتا ہے، وہ کسی خاص محدود نقطۂ نظر سے زندگی پر غور نہیں کرتا بلکہ بقول افلاطون کے "تمام زمان ومکان کا ناظر ہوتا ہے" کسی شئے پر فلسفیانہ طور پر نظر کرنے کے معنی یہ ہیں کہ نگاہ میں وسعت ہو، اس شئے کو دوسری تمام اشیاء کے ساتھ رکھ کر دیکھیں، تناسب کا پورا خیال ہو۔ ہم اس کی توجیہ میں ڈاکٹر جانسن کی زندگی کا ایک واقعہ پیش کریں گے۔ جس کو باسول نے بیان کیا ہے۔ باسول نے ایک روز جانسن اور ان کے چند رفقاء کی اپنے مکان پر دعوت کی۔ دعوت کے ایک روز قبل باسول کے لانڈ لارڈ نے اس کو اپنی انتہائے بدمذاقی سے مکان پر زیادہ آدمیوں کو مدعو کرنے کی اجازت نہیں دی۔ باسول نہایت آزردہ خاطر ہوا اور جانسن کو اس واقعہ سانحہ کی اطلاع دی۔ جانسن نے یہ سُن کر خندہ پیشانی کے ساتھ اپنے انداز میں کہا کہ "جناب ذرا سوچئے تو سہی یہ واقعہ کوئی بارہ مہینے بعد کس قدر حقیر معلوم ہوگا!" جانسن فکر ونظر کی رو سے نہ سہی کردار وعمل کے لحاظ سے پکا فلسفی تھا، اس نے فوراً یہ دیکھ لیا کہ انسان کی زندگی میں اس قسم کے بے شمار واقعات پیش آتے ہیں اور گزر جاتے ہیں، ان میں صرف ایک پر تمام توجہ کو مرکوز کرنا ان کے تناسب کو نظر انداز کرنا ہے۔ نگاہ میں تنگی پیدا کرنا ہے۔ فلسفی واقعاتِ عالم کو اپنے اپنے تناسب یا کرسی کے لحاظ سے دیکھتا ہے، کُل میں ہر ایک کو مناسب جگہ دیتا ہے، جانب داری، تعصب، تنگی، اس کی نگاہ میں نہیں پائے جاتے، بالفاظ دیگر وہ زندگی کو "ابدیت کی روشنی" میں دیکھتا ہے

بعض دفعہ فلسفہ کی تعریف اس طرح کی گئی ہے کہ "یہ حکیمانہ طریقوں کی مدد سے اس دنیا کو سمجھنے کی کوشش کا نام ہے جس میں ہم اپنی زندگی بسر کرتے ہیں"

ہماری اس مانوس دنیا کو جس میں ہماری بود وباش ہوتی ہے علوم مخصوصہ کے تمام نتائج وتعمیمات کی مدد سے پوری طرح سمجھنا طالیس .... کے زمانہ سے جو یونان کا پہلا فلسفی سمجھا جاتا ہے، اب تک فلسفہ کی غایت رہی ہے۔ دنیا بہت مانوس تو نظر آتی ہے لیکن آخر "دنیا" سے مُراد کیا ہے؟ یونان کے اہلِ نظر دنیا یا کائنات کو ہم معنی سمجھتے تھے۔ اور ہر زمانہ کے فلسفیوں نے نہایت ہمت وجرأت کے ساتھ اس عظیم الشان کائنات کی کنہ یا ماہیت کے پتہ لگانے کا کام اپنے سر لیا۔ کسی فلسفی شاعر ہی نے تو یہ کہا تھا کہ ارض وسما کہاں تیری وسعت کو پاسکے، میرا ہی دل ہے جہاں تو سما سکے، تو پھر کائنات کی وسعت ومرد یعنی مکان وزماں کی نوعیت کیا ہے، اس لامتناہی زمان ومکاں والی کائنات کے خالق کا نشان کہاں، اس کا مقصد وغائت کیا، اس کا مآیہ خمیر کیا، اس کا حضرت انسان، اس کی روح اور اس کے منہا سے تعلق کیا ہے، یہ وہ انتہائی وابدی سوالات ہیں جن کے جواب کی تلاش میں دیمقراطیس اور افلاطون اور ارسطو سینٹ آگسٹس، برونو، ڈیکارٹ، سپنوزا، کانٹ، ہیگل اور ہربرٹ اسپنسر اور دیگر اکابر فلاسفہ نے اپنی جانیں دیں اور یہی عظیم الشان سوالات اب تک قابل غور ہیں اور وارفتگان

عقل کے لئے ہمیشہ رہیں گے

موجودہ زمانہ میں ہمارا نقطۂ نظر زیادہ تر انفرادی و انسی واقع ہوا ہے، ہم دنیا پر کلّی نگاہ سے غور نہیں کرتے بلکہ معاشری، سیاسی، ادبی، اخلاقی اور مذہبی نگاہ سے اس کی تحقیق و تدقیق کرتے ہیں۔ قدمائے یونان کو ثبات و تغیر عالم کا مسئلہ پریشان کیا کرتا تھا، لیکن تغیر سے ان کی مراد مادّی تغیر تھی یعنی مادّی ذرات یا اجزا کی حرکت یا نشو ونما، زوال و فنا کے مظاہر، چنانچہ پارمینیڈیز کا خیال تھا کہ قدرت کے کارخانہ میں تغیر محال ہے، حواس کو بظاہر جو تغیر دکھائی دیتا ہے وہ محض فریب و التباس ہے، لیکن ہرقلیتوس کا یقین تھا کہ ثبات و سکوت کائنات کی کسی شے میں نہیں، دنیا سراپا تغیر، تجدد، تنوع ہے۔ یہ اور اس قسم کے مسائل اس میں کوئی شک نہیں کہ اب تک لاجواب ہیں لیکن ہماری دلچسپی دنیا کے کسی اور طرح کے تغیر سے وابستہ ہو گئی ہے، ہم معاشری رسوم، سیاسی علائق، اخلاق و ادب، مذہب اور ادبی معیارات کے تغیرات سے زیادہ دلچسپی رکھتے ہیں۔ لیکن اس قسم کی تغیر پذیر دنیا بھی توجیہ کی اسی قدر محتاج ہے جیسی کہ اجزائے مادّی کو تغیرات والی دنیا، لہٰذا فلسفہ کی ضرورت یقینی، فرق صرف اتنا ہے کہ اب فلسفۂ حیات اس کی قدر و قیمت، اس کی بدایت و نہایت و غرض و غایت کی توجیہ کرتا ہے اس لئے ارتقا، ترقی، ذہن کے طریقے، کردار و معاشرت کے مسائل زیادہ نمایاں اور پیش پیش ہو گئے ہیں۔ لیکن یہ ہمیشہ کے لئے صحیح ہے کہ فلسفہ اس دنیا کو سمجھنے کا نام ہے جس میں ہم اپنی زندگی بسر کرتے ہیں

شاید حاضرین میں سے بہت کم ایسے ہوں گے جن کے ذہن نے کبھی نہ کبھی اس قسم کے سوالات کو نہ اٹھایا ہوگا: کیا خدا کا وجود ممکن ہے یا سوائے مادہ اور (Energy) کے کوئی شے نہیں؟ مادّہ کا مایۂ خمیر کیا ہے؟ کیا درد سے زیادہ کوئی چیز حقیقی ہو سکتی ہے؟ اگر جلوہ فرمائی صرف مادہ کی ہے تو درد کیا چیز ہے، کیا یہ ذہن میں نہیں پایا جاتا تو کیا ذہن مادّہ سے جدا نہیں؟ میرا غور و فکر کرنا، درد و الم سہنا کیا صرف مادی جسم ہی سے تعلق رکھتا ہے، مادی جسم ہی کا وظیفہ ہے یا اس سے جدا شے ہے؟ میں زندہ ہوں۔ حیات کیا ہے؟ یہ مے کیا ہے جو بقول اقبال "تلخ تر او نکو ترست"؟ ایک روز مجھے موت آئے گی، موت کیا ہے؟ کیا یہ انسانی شخصیت کا خاتمہ ہے؟ ابو العتاہیہ نے حیرت کے عالم میں کیا خوب پوچھا تھا ؎

الموت باب وکل الناس یدخلہ[1]

یالیت شعری بعد الباب ما الدار

ہم آزاد نظر آتے ہیں، کیا یہ صحیح ہے؟ میر کا خیال تھا کہ ناحق ہم مجبوروں پر تہمت ہے مختاری کی! حافظ کا خیال تھا کہ

درپسِ آئینہ طوطی صفتم داشتہ اند!

واقعہ کیا ہے؟ مجھ سے آپ سے ہر طرح کے افعال سرزد ہوتے ہیں، بعض ان میں کے صائب ہیں اور بعض خطا پذیر، صواب

---

[1] موت ایک دروازہ ہے جس میں ہر شخص داخل ہوتا ہے، اے کاش یہ مجھے معلوم ہوتا کہ اس دروازے کے بعد مکان کونسا ہے۔

خطا کے کیا معنی ؟ ان کے معیار کیا ؟ ہم میں سے بعض تلاش زر میں سرگرداں ہیں ، بعض شہرت کے خواہاں ، اور بعض لذت کے دل دادہ اور "خوش باش دمے کہ زندگانی این ست" کے پیرو ۔ کیا یہ درحقیقت اعلیٰ قیمتیں ہیں ؟ یا ان سے اعلیٰ وارفع نصب العین موجود ہیں ؟ مثلاً رواقیہ نے " طمانیت نفس "کو خیر برتر قرار دیا تھا ، .... دنیا کی کوئی مصیبت ، دنیا کی کوئی خوشی ' اطمینان خاطر ' کو صدمہ نہیں پہونچا سکتی ، چنانچہ بی تھی اس (Bethesus) نے روما کے جیل خانہ میں " فلسفہ کے تسلی بخش لذات ، پر ایک طویل مقالہ لکھا تھا ۔ کیا اسی طرح محبت ، فرض ، تلاش حکمت ، فنون لطیفہ کا ذوق وغیرہ اعلیٰ قیمتیں قرار نہیں دی جا سکتیں ؟ ہم یہ تمام سوالات اٹھا سکتے ہیں ، کیا ان کا جواب دینا ممکن ہے ؟ علم انسانی کے حدود کیا ہیں ؟ اس کی اڑان کتنی ؟ علاوہ ازیں فطرت وصنعت میں خوبصورت اشیا ء میرا محاصرہ کئے ہوئے ہیں ، اکثر بدصورت بھی ہیں ، حسن کیا ہے ؟ ایک خوبصورت عمارت میں ، ایک حسین چہرہ میں ، موسیقی کے ترنم میں وہ کیا چیز ہے جس سے ہم کیف اندوز ہو رہے ہیں ؟ اگر آنکھیں نہ ہوتیں ، .... ذہن نہ ہوتا تو کیا پھر بھی فطرت پوشاکِ حسن میں ملبوس ہوتی ؟ یہ سب فلسفیانہ سوالات ہیں ، ان کا پیش کرنا انسان کی فطرت کا تقاضا ہے ، ان پر غور و فکر کرنا ، حکیمانہ طور پر ، تدقیق و تحقیق کے ساتھ ان کا مطالعہ کرنا ، ان کے جواب فراہم کرنے کی سعی کرنا —— گو یہ سعی لاحاصل سہی —— فلسفہ ہے ، یا جیسے فلسفہ کے ایک شیدائی ولیم جیمس نے کہا ہے ، " فلسفہ واضح طور پر فکر کرنے کی ایک غیر معمولی و مستقل کوشش کا نام ہے " یہ کام اللہ کا نہیں حیوان مطلق کا نہیں انسان کا ہے ، ہر انسان کا خواہ وہ حیوانیات کا پروفیسر ہو یا تاریخ کا !

ان سوالات کا مبدا تجسس واستعجاب ہے ، انسان کی حیوان سے وجہ امتیاز یہی تجسس کا جذبہ ہے اور اسی کو افلاطون نے فلسفہ کا مبدء قرار دیا ہے ، افلاطون کے ہم وطنوں نے اپنی زندگی فلسفہ کے لئے وقف کر دی تھی ، لیکن ہمارے مقابلہ میں ان کا کائنات کے متعلق نقطۂ نظر سادہ اور طفلانہ تھا ، تاہم ان کی طبیعت میں تعجب زیادہ تھا ، وہ دنیا کی ہر شے ہر منظر پر استعجابانہ نظر ڈالتے تھے اور بہت جلد ان کے اس استعجاب و تحیر نے ان کو فلسفہ کی راہ پر لگایا ، اس زاویہ نگاہ سے ، ہم فلسفہ کی اس طرح تعریف کر سکتے ہیں کہ " یہ وہ استعجاب ہے جو سنجیدہ و متین فکر کی صورت اختیار کر لیتا ہے "

ایک چھوٹی لڑکی دریچہ سے منہ نکال کر غور و خوض کے ساتھ راہروؤں کے دارفتہ حرکات دیکھ رہی تھی ، ایکدم وہ پلٹی اور اپنی ماں کے منہ سے منہ ملا کر پوچھنے لگی " اماں میری یہ سمجھ میں نہیں آتا ، تم ہی بتلاؤ کہ یہ دنیا کہاں سے آئی ؟ " اس معصوم جان کا اس طرح فکر کرنا فلسفہ ہے ! ہم میں سے بہت سارے ، بچے اور بڑے ، دنیا کے متعلق کچھ استفسار نہیں کرتے ، جیسی بھی ہو قبول کر لیتے ہیں ، لیکن بعض غور و فکر کرنے والے ہوتے ہیں ، انھیں دنیا ایک کہنہ کتاب سی معلوم ہوتی ہے جس کا آغاز و انجام نامعلوم ، ع اول و آخر ایں کہنہ کتاب افتاد است وہ اس کی

بدایت و نہایت کا حال معلوم کرنا چاہتے ہیں اور خود اپنے متعلق پوچھتے ہیں کہ ؎

عیاں نہ شد کہ چرا آمدم و کجا بودم
دریغ و درد کہ غافل ز کار خویشتنم!

فلسفہ کا لفظ یونانی الفاظ سوفیا اور فیلوس سے مشتق ہے جن کے معنی "محبتِ حکمت" کے ہیں۔ سقراط انکسار کے ساتھ اپنے آپ کو "فلسفی" کہتا تھا یعنی "طالب حکمت" جو انسان کی غرض و غایت وجود اور اس کے فرایض کی تلاش میں جان تک کو عزیز نہ رکھتا تھا - ارسطو کے نزدیک انسانی عقل حکمتِ الٰہی کا ایک جزو ہے، خدا کا علم کلی ہے' ہماری عقل کا یہ پیدائشی حق ہے کہ یہ بھی کلی علم کی تلاش کرے، لیکن فلاطون وارسطو دونوں اپنے آپ کو "طالب حکمت" کہتے تھے، اور فلسفہ کے اس لفظی معنی کے لحاظ سے ہر عاشق حکمت فلسفی کہلایا جاسکتا ہے

شعر اور فلسفہ

شعر اور فلسفہ کے مقابلہ سے فلسفہ کے نئے معانی پر روشنی پڑ سکتی ہے - اکابر شعرا میں سے بعض زندگی کو محض بیان کرنے پر قانع نظر آتے ہیں لیکن بعض اس کی توجیہ و تعبیر کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس کی بدایت و نہایت، غرض و غایت نوعیت و ماہیت کی تشریح کرتے ہیں، یہی فلسفی شعرا ہیں۔ روما کا مشہور شاعر لکری شیس فلسفی تھا، اپیکیورس نے فلسفہ کو اپنے شعر میں ادا کیا، اللہ کا انکار، حیات بعد الموت کا انکار، طمانیت خاطر اور مسرت" ماہیت فطرت' والی شہرۂ آفاق نظم کے ہر شعر سے ظاہر ہے - خیام فلسفی شاعر ہے، اسرارِ ازل، مائیت کائنات، غایت وجود، راز مسرت کے متعلق اس کے خیالات گو عقل کے نہیں تاہم تخیل کے لئے نہایت خوشگوار ہیں

اسرارِ ازل را نہ تو دانی نہ من | ایں حرف معما نہ تو خوانی و نہ من
ہست از پس پردہ گفتگوے من و تو | چوں پردہ بر افتد نہ تو مانی و نہ من

در چرخ بانواع سخنہا گفتند | ایں بے خبراں گوہر دانش سفتند
واقف چو نگشتند باسرارِ فلک | اول .... زدند و آخر خفتند

خیام اگر بادہ پرستی خوش باش | با لالہ رخے اگر نشستی خوش باش
چوں عاقبت کار جہاں نیستی ست | انگار کہ نیستی چو ہستی خوش باش

ڈانٹے برترین فلسفی شاعر ہے - وہ اپنی (Divine Comedy) میں ہمیں کائنات کی شکل و صورت سے انسان کی بدایت و غایت سے، شر کی ابتدا اور اس کے علاج سے واقف کرتا ہے۔ "فردوس" (Paradise) کے

تابناک اشعار میں ہم پڑھتے ہیں کہ قلب کائنات سے حُبّ الٰہی کی ستنیر شعاع پیدا ہوتی ہے جس کا مقصد انسان کو معصیتوں سے پاک کرنا ہوتا۔ جرمنی کا زبردست شاعر گیٹے بھی مفکر اور فلسفی ہے۔ اس کی شاعری کا موضوع بھی نجات انسانی ہے، لیکن اس کے نزدیک یہ زہد و تقوے سے نہیں تجربہ سے حاصل ہوتی ہے۔ ورڈسورتھ کو "اس ناقابل فہم عالم کے بارگراں" نے عاجز کر رکھا تھا اور براؤننگ "نباض قلب" خدا، صداقت و محبت سے ہمیں تشفی بخشتا ہے:۔

ان فلسفی شعراء کی حیرت ناک دلکشی اس امر کا اکتشاف کرتی ہے کہ انسان کے سینہ میں 'اسرار ازل' کو دریافت کرنے اور اس "حرف معمہ" کو پڑھنے کی کتنی زبردست خواہش موجود ہے اور ہم ان شعراء کے کلام سے کس قدر تسلی و آرام حاصل کرتے ہیں اور بعض دفعہ شاعری جزو یست از پیغمبری' کہ اٹھتے ہیں۔ ایجی کس، سوفوکلیس یوری پڈیس سب کے سب پیغام بر، معلم اخلاق و مفکر تھے اور اپنی قوم کو انھوں نے اپنے پیغامات سے جگا دیا

زمانۂ حال میں، ہم دیکھ رہے ہیں کہ ڈرامہ کس قدر فلسفیانہ بنے جا رہے ہیں۔ ڈرامہ نویس حیات کے عمیق مسائل سے الجھ کر انھیں سلجھانے کی کوشش کرتا ہے۔ اِب سن اس نئے ڈرامہ کا منبع ہے۔ جہاں بجائے شاعر و صناع کے مفکر و معلم کام کرتا ہے۔ اب سن قدامت کے افکار رفتہ و مضر روایات سے نجات پانا چاہتا ہے اور اس کے ڈرامہ کے پڑھنے والوں یا دیکھنے والوں میں جو احساسات پیدا ہوتے ہیں وہ اس قدر جمالیاتی نہیں ہوتے جس قدر کہ تفکری۔ برنارڈ شا کے ڈراموں میں جمالیاتی عنصر صرف نام ہی کو رہ گیا ہے اور سوائے وعظ و تفلسف کے کچھ نہیں۔ اِب سن و شا، گالس ورثی اور روسی اسکول کے مصنفین کی تصانیف میں جو حیرت ناک دلچسپی لی جا رہی ہے اس سے یہ صاف ظاہر ہے کہ ہم اپنے شکوک کو رفع کرنے، زندگی کے اسرار کو پانے کے کس قدر خواہاں ہوتے ہیں، بقول ایک فلسفی کے ہم مابعد الطبیعیاتی حیوان ہیں، ہم دریافت کرنا چاہتے ہیں کہ کشمکش حیات کے باطنی اصول کیا ہیں یہ تنازع ہمیں کس جانب لے جا رہا ہے، کیا انتخاب فطرت کورانہ ہے یا کوئی "دست غیب" اس کے تحت رہنمائی کر رہا ہے۔ بہرحال شاعری کا یہ فلسفیانہ رجحان اس امر کا بیّن ثبوت ہے کہ فلسفے اور اس کے مسائل میں، جو زندگی کے مسائل ہیں، ہمیں اب بھی گہری دلچسپی ہے اور روز بروز افزوں ہوتی جا رہی ہے

فلسفہ اور سائنس

کہا جاتا ہے کہ فلسفہ اور سائنس کے درمیان ہمیشہ جنگ رہی ہے، ہم موجودہ نقطۂ نظر سے ان کے باہمی تعلق پر روشنی ڈالیں گے، اختصار ہمارے پیش نظر ہوگا۔ فلسفہ اور سائنس میں نہایت قریبی تعلق ہے، دونوں کا مبدء و ماوی وہی ایک ہے، "حُبّ علم" ان کی ابتدا اور "علم حقیقت" ان کا منتہا ہے۔ اب خیال صحیح نہ رہا کہ فلسفیانہ نظامات بغیر مادی علوم کی احتیاج کے تشکیل پا سکتے ہیں۔ فلسفہ اور سائنس کا تعلق اس قدر قریبی ہے کہ فلسفہ کا طالب علوم مخصوصہ خصوصاً ریاضیات، طبیعیات، کیمیا، حیاتیات اور نفسیات کے کسی قدر علم کو لابدی سمجھتا ہے۔ لیکن ان علوم کا دائرہ ہر

روز وسیع ہوتا جا رہا ہے اور ان تمام پر عبور حاصل کرنا کسی کے لئے آسان نہیں اسی لئے فی زمانہ فلسفہ اپنی توجہ زیادہ تر تصورات کلیہ کی ناقدانہ تحلیل اور قیمتوں اور معانی کے مطالعہ پر مبذول کر رہا ہے۔ تاہم آئیڈیل فلسفی تو وہی ہوگا جو تمام علوم مخصوصہ پر مہارت رکھتا ہو

سائنس (یا حکمت) لاطینی لفظ ہے "جو علم" کے ہم معنی ہے، حکیمانہ علم "متیقن، صحیح، اور پوری طرح مربوط و منضبط ہوتا ہے" فلسفہ بھی دنیا کے متعلق علم حاصل کرنا چاہتا ہے۔ لہٰذا فلسفہ اور سائنس دونوں کا ایک ہی مقصد ہوگا۔ لیکن ان دونوں میں فرق ضرور ہے اور بعض دفعہ اس فرق کو اس طرح ادا کیا گیا ہے کہ سائنس کا کام واقعات کا "بیان" (Describe) ہے اور فلسفہ کا کام ان کی "توجیہ و تعبیر" (Interpret) ہے اور تھامسن نے پیرسن اور دوسرے علمائے سائنس کا تتبع کرتے ہوئے سائنس کی اس طرح تعریف کی ہے کہ

"سائنس واقعات تجربہ کا سادہ سے سادہ الفاظ میں کامل و متوافق بیان ہے"

مظاہر عالم کے ایک مجموعہ کا عالم سائنس کا مطالعہ کرتا ہے، وہ سب سے اول متعلقہ واقعات کو جمع کرتا ہے، پھر ان کی تحلیل کرتا ہے، پھر ان کا اصطفاف کرتا ہے، پھر ان شرائط یا (علل) کا مطالعہ کرتا ہے جن کی تحت یہ وقوع پذیر ہوتے ہیں، ان کی یکسانیت عمل کا تعین کرتا ہے یعنی ان کے قوانین کو دریافت کرتا ہے اور آخر میں ان کو ایک مربوط و مرتب مقالہ کی صورت میں پیش کرتا ہے اور یہاں پر اس کا کام بحیثیت عالم سائنس کے ختم ہو جاتا ہے یعنی اس نے واقعات تجربہ کا سادہ الفاظ میں کامل و منضبط بیان پیش کر دیا۔ ان کے طرز وقوع و طریقہ عمل کو سمجھا دیا

اب فلسفہ بھی سائنس کی طرح اسی علم کا متلاشی ہے جو متیقن صحیح اور مربوط و منضبط ہو، لیکن وہ محض اسی علم پر قانع نہیں، وہ اس علم کا جویا ہے جو جامع ہو مظاہر کے غیر مبدل توالیات یا قوانین کا تعین ذہن انسانی کو پوری طرح مطمئن نہیں کر سکتا وہ اشیاء یا واقعات کی انتہائی توجیہ و تعبیر کا خواہاں ہوتا ہے یعنی وہ ان کی علت اولی، ان کی بدایت و غایت، ان کے معنی یا قدر و قیمت کا جویا ہوتا ہے۔ سائنس محض واقعات کے وقوع کے شرائط کا بیان پیش کرتی ہے۔ لیکن فلسفہ ان کی انتہائی توجیہ یا تشریح کرنا چاہتا ہے، زمانۂ حال کے ایک زندہ سائنٹفک فلسفی نے اسی چیز کو اچھی طرح ادا کیا ہے:- "فلسفہ مختلف علوم و سائنس کے نتائج کو لیتا ہے اور ان کے ساتھ انسان کے مذہبی و اخلاقی تجربات کے نتائج کو ملاتا ہے اور پھر ان پر بہ حیثیت مجموعی غور و فکر کرتا ہے۔ امید یہ ہوتی ہے کہ ہم اس طریقہ سے کائنات کی کنہ و ماہیت، ہماری حیثیت و منزلت کے متعلق بعض عام نتائج حاصل کر سکیں"

اس میں شک نہیں کہ فلسفہ کے اس عظیم الشان مقصد کے حصول کی خواہش پر اس کے عالم گیر وسعت ہی کی بنا پر علماء سائنس کی جانب سے اعتراضات وارد ہوتے ہیں کہ یہ کام خداؤں کا ہے، ضعیف البنیان انسان اس کو حاصل نہیں کر سکتا۔ اس کا تفصیلی جواب ہم آگے چل کر پیش کریں گے۔ لیکن یہاں صرف اتنا کہنا ضروری ہے

کر "کل" کو سمجھنے کی کوشش بذات خود مورد اعتراض نہیں بن سکتی، کیونکہ انسان کو اس سے ہمیشہ دلچسپی رہی ہے اور انسانی دلچسپی کا ہر معروض حکیمانہ تحقیقات کا موضوع بن سکتا ہے بشرطیکہ حکیمانہ طریقے استعمال کئے جائیں۔ اعتراض تو اسی وقت وارد ہو سکتا ہے جب غلط طریقے استعمال کئے جائیں اور اس میں کوئی شک نہیں کہ اوائل میں منطقی طریقوں کا استعمال فلسفہ کے مطالعہ کے وقت نہیں کیا گیا۔ لیکن ہم آگے چل کر بتائیں گے کہ خود سائنس کے مطالعہ میں ہی منطقی طریقوں کا استعمال گزشتہ زمانوں میں نہیں کیا گیا، فکلا ہما سواء

بہر حال طریقوں کی بحث چھوڑ کر ہم کہہ سکتے ہیں کہ فلسفہ کے دو جداگانہ مقاصد ہیں اور دونوں سائنس کے عمل سے مختلف ہیں اور دونوں فکرِ انسانی کی جائز ضروریات ہیں۔ اولاً دنیا من حیث کل پر اور خصوصاً اس کے معنی، مقصد یا غائت اور قدر وقیمت پر۔ ثانیاً ان تصورات کلی کا ناقدانہ امتحان جو سائنس اور فہم عام کے استعمال میں آتے ہیں۔ پہلے کو فلسفہ نظری کہا گیا ہے اور دوسرے کو فلسفہ انتقادی

مقصدِ اوّل کے متعلق ہمیں یہ خوب یاد رکھنا چاہئے کہ ذہنِ انسانی کی یہ عمیق ترین خواہش ہے کہ دنیا و زندگی کے متعلق وہ نقطۂ نظر حاصل کیا جائے جو فلسفہ کے لئے مخصوص ہے، ہمیں دنیا کا محض ایک کمی نقطۂ نظر یا محض اس کے ریاضیاتی علائق ہی کا علم درکار نہیں بلکہ اس کی ماہیت یا کیفی و باطنی خصوصیت (اسرارِ ازل)، کا علم مطلوب ہے اس زمانہ میں سائنس کے دائرہ میں جتنی بھی ریسرچ ہو رہی ہے۔ ان سب میں کمی علائق پر زور دیا جا رہا ہے، سب کیف کے جواب سے قاصر ہیں، کمیت کی ناپ تول، تحقیق تدقیق جاری ہے۔ حکیمانہ نقطۂ نظر سے سائنس کی یہ تحدید کوئی نقص نہیں کہ وہ کیفیت، معنی و قیمت کے سوال کو اپنے دائرہ بحث سے خارج سمجھتی ہے، لیکن اس کا تکملہ فلسفہ سے کیا جانا چاہئے۔ ممکن ہے کہ دُنیا میں نہ مقصد ہو نہ غائت، اور نہ اس کی قدر و قیمت ہی کچھ ہو لیکن اس نتیجہ تک بھی ہم فکر و نظر کی ایک غیر معمولی و مستقل کوشش ہی کے بعد پہونچ سکتے ہیں اور اسی غور و فکر کا نام فلسفہ ہے

مقصدِ دوم (تصورات کی ناقدانہ تحلیل)، کے متعلق ہم یہاں صرف اتنا کہنا چاہتے ہیں کہ سائنس اور فہم عام کے بعض ایسے کلی تصورات ہیں جن کی وہ پوری طرح جانچ پڑتال نہیں کرتے بلکہ محض عملی تعریف کرنے کے بعد اپنے عملی مقاصد کے حصول کے لئے ان کا استعمال شروع کر دیتے ہیں۔ اس قسم کے تصورات کی مثال مکان و زماں، کیفیت و کمیت، علیت و قانون، خیر و شر، وغیرہا سے دی جا سکتی ہے۔ اب فلسفہ کا یہ مخصوص کام ہے کہ ان تصورات کلیہ کا پوری طرح امتحان کرے، ان کی ناقدانہ تحلیل کرے، اور ان کے معانی و روابط کو بالاستیعاب سمجھنے کی کوشش کرے۔ برٹرنڈرسل وغیرہ نے اسی کام کو فلسفہ کا واحد وظیفہ قرار دیا ہے۔ ان دنوں یہ نہایت ٹکنکل چیز ہو گئی ہے اور ہم سر دست اس میں داخل ہونا نہیں چاہتے

فلسفہ اور مذہب ——— ہم فلسفہ اور مذہب کے باہمی تعلق پر اس لئے غور کر رہے ہیں کہ فلسفہ کی اہمیت

اور اس کی افادیت اور زیادہ واضح اور اجاگر ہو جائے - عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ فلسفہ اور مذہب میں بیر ہے، واقعہ اس کے خلاف ہے، مندرجہ ذیل مختصر واقعات سے آپ خود اس کا اندازہ کر سکیں گے

فلسفہ اور سائنس میں جس قسم کا تعلق بتلایا گیا اس سے فلسفہ اور مذہب کا تعلق جداگانہ ہے۔ فلسفہ کائنات من حیث کل کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہے، یہ دنیا کے متعلق سائنس سے زیادہ جامع، کامل اور وحدت بخش علم حاصل کرنا چاہتا ہے - لیکن مذہب کو اس سے بھی زیادہ کامل وحدت کی تلاش ہے، فلسفہ ایک ایسے تصور کی تلاش کرتا ہے جو ہماری مضطرب عقل کو دنیا کے معنی سمجھا دے۔ لیکن مذہب فرد و عالم کے حقیقی وحدت و وفاق کو جاننے کی کوشش کرتا ہے، مذہب میں ہماری کوشش مبدء عالم سے ایک ہو جانے کی ہوتی ہے، ہم اس میں محو ہو جانا چاہتے ہیں اور اس طریقہ سے اس کی معرفت حاصل کرنا چاہتے ہیں

کہا گیا ہے کہ مذہب کا کام انسان کو دنیا میں طمانیت نفس و جمعیت خاطر بخشتا ہے، لیکن سائنس اور فلسفہ بھی ہمارے علم میں پہنائے عالم، پیدا کرنے اور لذت وقوف بخشنے کی وجہ سے قلب میں ایک خاص قسم کی طمانیت پیدا کرتے ہیں - سائنس، فلسفہ اور مذہب یہ تینوں دنیا کو جاننا اور سمجھنا چاہتے ہیں - یہ ان کی غایت مشترکہ قرار دی جا سکتی ہے، لیکن اس علم سے ان کی غرض جدا جدا ہے - سائنس کی غرض علم کو علم ہی کی خاطر حاصل کرنا ہوتی ہے لیکن زیادہ تر یہ علم کو عملی و معاشی اغراض کی تحت رکھتی ہے - فلسفہ کی غرض محبت علم اور اس سے پیدا ہونے والی ذہنی طمانیت و لذت ہوتی ہے - مذہب کائنات کو اس لئے سمجھنا چاہتا ہے کہ روح انسان کو جمعیت، چین اور نجات حاصل ہو - بعض وقت فلسفہ اور مذہب ان ہی تصورات سے بحث کرتے ہیں مثلاً روح، اس کی بدایت و غایت، خدا اور تخلیق لیکن یہاں بھی ان دونوں کے اغراض جدا جدا ہوتے ہیں - اول الذکر میں یہ نظری اور عقلی ہیں اور ثانی الذکر میں یہ جذبی و شخصی!

فلسفہ انفرادی ذہن کی پیداوار ہے، صنمیات یا مذہب مجموعی ذہن کی - فلسفہ کسی فلسفی کی ذہنی کوششوں کا نتیجہ ہوتا ہے، بغیر فلسفی کے فلسفہ ناممکن، اسی وجہ سے ہم ہر فلسفہ کو کسی فلسفی کے نام سے موسوم کرتے ہیں مثلاً فلاطونی فلسفہ، اور ارسطاطالیسی فلسفہ، وغیرہ اس کے برخلاف صنمیات یا مذہب احادیث الطوائف (Folk lore) اور زبان کی طرح کسی فرد کے عمل شعوری کا نتیجہ نہیں بلکہ پوری قوم کا آفریدہ - جس طرح زبان کا کوئی موجد نہیں اسی طرح صنمیاتی و مذہبی عقائد کا کوئی موجد نہیں، ان کی ابتدا زبان و شاعری سے جا ملتی ہے - کیا ان دنوں کوئی مصری یا یونانی مذاہب کے بانیوں کا ذکر کرتا ہے؟ اس میں شک نہیں کہ عیسائی و اسلامی مذاہب کے بانی ضرور گزرے ہیں (صلواۃ اللہ علیہم) لیکن غالباً انھوں نے کسی ایسے نئے تصورات کی تخلیق نہیں کی جو پہلے معلوم نہ تھے، انھوں نے مروجہ خیالات میں اصلاح کی جس کا مقصد نظری سے زیادہ عملی تھا

فلسفہ نظر و فکر کرنے والے ذہن کا نتیجہ ہوتا ہے ہر فرد اس میں "فکر" کی وجہ سے حصّہ لیتا ہے، لیکن مذہب پر وہ "ایمان" رکھتا ہے، یہ اس کا اپنا ذاتی معاملہ ہے، کسی کو اس میں دخل دینے کی ضرورت نہیں

لیکن آخر مذہب کیا ہے؟ اگر اس کی تعریف ناممکن ہے تو کسی قدر معنیٰ کا تعین تو ضرور ہو سکے گا۔ مذہب پر جب آپ غور کرتے ہیں تو شاید اختلاف کی وجہ سے مسجد و حرم، دیر و کلیسا، مصلّیٰ و ناقوس، تسبیح و زاہد خیال میں آتے ہیں لیکن ظاہر ہے کہ یہ چیزیں ضروری طور پر مذہب تو نہیں۔ اب مذاہب عالم پر نظر غائر ڈالیں، ان کے اجزائے مشترکہ پر غور کریں تو ہم مذہب کی کسی تعریف تک پہونچ سکیں گے شاید وہ کچھ اس قسم کی ہو: "مذہب غیب کی اُن قوتوں پر بھا اسرار کرنے کے احساس کا نام ہے جن کی قدرت میں ہماری قسمت کی باگ ہے، ساتھ ساتھ ان قوائے غیبی سے صادقانہ تعلقات قائم کرنے کی خواہش بھی ہوتی ہے" یا "مذہب ایک غیر مری روحانی نظام سے ہمارے عملی تعلق کا شعور ہے"

"مذہب ہمارے باطن کے اعلیٰ ترین جوہر کے ساتھ وفا شعاری کا احساس ہے" ایمرسن نے خوب کہا ہے کہ "میں، ناقص میں، اپنے کامل نفس کی پرستش کرتا ہوں" ان تعریفات سے معلوم ہوتا ہے کہ مذہب کی بُنیاد اعلےٰ قیمتوں کے عمیق جبلّی احساس پر ہوتی ہے۔ ہماری ذات میں جو الٰہیت کا جوہر مکنون و مستتر ہے وہ اُس جوہر الٰہی کی طرف بڑھتا ہے جو ہم سے ماورا، سارے عالم پر محیط ہے، جس کا سارا عالم خارجی اظہار ہے۔ یا مذہب ان ہی اعلیٰ و انتہائی قیمتوں کی طرف اس خاک و باد کی دنیا اور اس کے آرام و لذائذ سے بلند ہو کر دیکھنا اور ان کی طرف باطنی ہمدردی اور شناخت کی وجہ سے کھنچ جانا ہے۔ اسی بنا پر ونٹ نے کہا ہے کہ "ہم ان احساسات یا تصورات کو مذہبی کہیں گے جو ایک نصب العینی وجود کی طرف اشارہ کرتے ہیں" اسی وجہ سے مذہب کے اسمار، علائم، و اشخاص پاک و مقدس سمجھے جاتے ہیں، یہ برترین قیمتیں ہیں، دنیا کی معمولی و ادنیٰ چیزوں سے ماورا ہیں، اور اسی لئے مذہبی پہلو وفا شعاری، تحریم، تواضع و زہد کا ہوتا ہے

مذہب کی اس تعریف کے لحاظ سے روح، روحانی یا روحانیت کے الفاظ میں کسی قسم کا ستر و غموض نہیں پایا جاتا یہ ان چیزوں کے طرف اشارہ کرتے ہیں جن کی اعلےٰ قیمتیں ہوتی ہیں، چنانچہ جارج سنٹیانا کہتا ہے کہ روحانی ہونے سے مراد "نصب العین کے حضور میں زندگی بسر کرنا ہے" ذریک نے اپنی کتاب "مسائل فلسفہ" میں روحانیت کے معنی اور مذہب سے اس کے تعلق کو بڑی اچھی طرح ظاہر کیا ہے

"قلب و ارادہ کا وہ میلان جس کی وجہ سے انسان اعلیٰ چیزوں کی پروا کرتا اور رفق و ملائمت و طمانیت باطنی کے ساتھ زندگی بسر کرتا اور حیات کے سطحی واقعات سے متاثر نہیں ہوتا اپنی باطنی ماہیت کے لحاظ سے روحانیت کہلاتا ہے، اور جب یہ خارجی صورتوں اور اداروں میں رُونما ہوتا ہے اور تمام جماعتوں میں پھیل جاتا ہے تو ہم اس کو مذہب

کہتے ہیں" (مسائل فلسفہ ص ۲۴۴)

اس طرح پر سمجھا جائے تو پھر مذہب کوئی غامضانہ، تحکمانہ، یا پُراسرار شئے نہیں رہتا بلکہ وہ ایک حاجت مند روح کی جبلی آواز بن جاتا ہے۔ مذہب انسان کی جبلیت میں داخل ہے، وہ ایسی چیز نہیں جس کی صداقت پر ہم معترض ہوں یا اس کی شہادتیں تلاش کی جائیں۔ اس کی بنیاد تو اس امر پر ہے کہ ہم اعلیٰ اقدار یا قیمتوں کے دائرہ حکومت کو تسلیم کرتے ہیں اور ان سے ایک قسم کی جبلی ہمدردی رکھتے ہیں اور ان کے آرزومند ہوتے ہیں۔ اور چونکہ مذہب ان اعلیٰ اقدار کو ہمیشہ ہماری نظروں کے سامنے رکھتا ہے اور انھیں دنیا کے لذائذ و رغائب کے باوجود فراموش ہونے نہیں دیتا اس لئے مذہب انسان کی زندگی میں سب سے زیادہ خوبصورت شئے ہے

مذہب اور فلسفہ کا تعلق کتنا قریبی ہے وہ اس بیان سے واضح ہوگیا ہوگا۔ کیونکہ اگر مذہب کی یہ تعریف کی جائے کہ یہ ان روحانی اقدار یا قیمتوں کا استحکام ہے جو روحِ انسانی میں ہمیشہ موجود ہوتی ہیں لیکن بعض اوقات خفتہ حالت میں ہوتی ہیں تو پھر فلسفہ کا یہ کام ہوگا کہ وہ ان قیمتوں کی تحقیق کرے، ان کے مبدء و ماخذ کا پتہ چلائے، ہم نے ابتدا میں فلسفہ کی تعریف ہی یہ کی تھی کہ فلسفہ "معانی اور قیمتوں کے مطالعہ کا نام ہے" اور اگر مذہب روحِ انسانی کا کائنات کی اعلےٰ قوتوں کو لبیک کہنا ہے تو فلسفہ کا کام یہ ہوگا کہ ان الٰہی قوتوں کے وجود کے دلائل و براہین پیش کرے۔ یا اگر مذہبی پہلو کے لئے اس امر کا یقین کرنا کسی طرح ضروری ہے کہ اشیاء کے پس پردہ کوئی ایسی قوت ہے جو فطرت انسانی سے کوئی نہ کوئی شئے مشترک رکھتی ہے جس کو، ہم نہایت احتیاط کے ساتھ شخصی کہہ سکتے ہیں تو فلسفہ کا یہ فریضہ ہوگا کہ اس امر کا تعین کرے کہ سائنس یا مابعد الطبعیات میں کوئی ایسی چیز تو نہیں جو ہمیں اس شخصی قوت کے وجود پر یقین کرنے سے باز رکھے، یا اگر سائنس یا مابعد الطبعیات میں کوئی وجہ اس پر یقین کرنے کی ملتی ہے تو وہ کیا ہے ؟

یہ اکثر دریافت کیا جاتا ہے کہ فلسفیانہ تعلیم کا مذہب پر کیا اثر پڑتا ہے ؟ ہمارے خیال میں یہ اثر نہایت مفید ہوتا ہے۔ ممکن ہے کہ ابتداءً فلسفہ کا مطالعہ ہمارے بعض مذہبی عقائد و خیالات میں کسی قدر خلل پیدا کرے خصوصاً جب ہمارے یہ عقائد بالکل کوتاہ، ناقابلِ مصالحت یا شدید الحقد..... ہوں۔ لیکن اگر یہ وسیع کشادہ اور سادہ ہوں تو فلسفہ ان کی تائید کرتا اور انہیں تقویت بخشتا ہے۔ بیکن نے کہا ہے کہ " یہ صحیح ہے کہ تھوڑا سا فلسفہ انسان کے ذہن کو الحاد کی جانب مائل کرتا ہے۔ لیکن فلسفہ میں تعمق انسان کے ذہن کو مذہب کی طرف رجوع کردیتا ہے" دراصل فلسفہ کا یہ کام ہے کہ وہ ہمارے اساسی مذہبی اذعانات کو عقل کی "بنیانِ مرصوص" پر مستحکم طور پر قائم کردے تاکہ جبلی تنفیات "دین العجائز" مادیت و الحاد کے طوفان میں غرق نہ ہوجائیں۔ بعض دفعہ ہمارے ان جبلی احساسات مذہبی میں ارتعاش ہوتا ہے اور ہمیں خوف ہوتا ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ "نجس" سائنس ہمارے ان اذعانات کو برباد نہ کردے۔ فلسفہ ہمیں پہاڑ کی چوٹی پر لے جاتا ہے اور ہم وہاں سے شک و ریب کی وادی پر نظر ڈالتے ہیں، علم سے ہمیں قوت حاصل ہوتی ہے، خوف رفع

ہوتا ہے، جس چیز کو ہم نے بدترین سمجھا تھا، وہ اپنے پورے خدوخال، پورے تناسب میں کچھ بری نہیں معلوم ہوتی، پھر ہمیں جو طمانیت و سکون حاصل ہوتا ہے وہ ابدی ہوتا ہے

فلسفہ کے امکان کا سوال

فلسفہ کو شاعری، سائنس اور مذہب کے تقابل سے آپ نے کسی قدر تفصیل کے ساتھ دیکھا، "فلسفیانہ مسئلہ" یا موضوع کو مشکل سمجھئے تو اس کی وسعت سے آپ کو ایک قسم کا خوف یا تحیر ہوگا۔ حقیقت کی کنہ یا ماہیت، کائنات کے معانی و مقصود، اس کی بدایت وغائت، حیات کی قدر و قیمت یہ ایسے عظیم الشان سوالات ہیں کہ ان کا بالاستیعاب مطالعہ کرنا۔ کسی قسم کا حل پیش کرنا بڑی ہمت کا کام ہے! عالم سائنس جو دنیا کے ایک گوشہ کو لیتا اور اس کو پوری طرح سمجھنے میں اپنی تمام قوتوں کو صرف کر دیتا ہے وہ فلسفی کے دائرہ بحث کے توسع و کشادگی کو دیکھ کر اٹھتا ہے کہ یہ کام دیوتاؤں کا ہے انسان کا نہیں کیونکہ ؎

من می نگرم ز مبتدی تا استاد
عجز ست بدست ہر کہ از مادر زاد (خیام)

لیکن خود یہ عالم سائنس جانتا ہے کہ اس کا دائرہ بحث کتنا ہی چھوٹا کیوں نہ ہو دوسرے علوم کے دائرے کچھ اس طرح مربوط ہے کہ خواہی نخواہی اس جز کے کامل علم کے لئے "کل" کا مطالعہ ضروری ہے اور اس طرح وہ مجبوراً فلسفہ ہی کے دائرہ میں قدم زن ہوتا ہے یا کم از کم فلسفی پر اعتراض کرنا ترک کر دیتا ہے

تاہم مفکرین کے بعض گروہ ایسے گزرے ہیں جنھوں نے فلسفیانہ مسائل کی وسعت سے گھبرا کر اس کے مطالعہ ہی سے انکار کر دیا ہے، ان میں سے ہم دو کا اختصار کے ساتھ ذکر کریں گے۔ ان میں سے ایک ایجابیت اور دوسری ارتیابیت ہے

ایجابیت:-

فرانس کے فلسفی اگست کامت (۱۷۹۸ء تا ۱۸۵۷ء) نے دنیا کے متعلق اپنے نقطۂ خیال کا نام ایجابیت رکھا ہے، گو حقیقت میں یہ خود فلسفی ہے جو فکر کی مستقل اور غیر معمولی کوشش کے بعد دنیا کے متعلق ایک خاص نقطۂ نظر تک پہونچا ہے لیکن وہ فلسفہ کے نام سے بیزار ہے۔ اس کا یقین تھا کہ علت العلل یا علت اولیٰ، آخری یا انتہائی حقیقت اور اس قسم کی ساری چیزوں کی تلاش محض فضول ہے۔ انسان کے ذہن کی رسائی ان حقایق تک نہیں ہو سکتی، وہ تجربہ کے واقعات یا مظاہر اور ان کی یکسانیت عمل یا قوانین ہی تک محدود رہتا ہے۔ ظواہر کے پس پردہ کیا ہے اور اشیا کما ہی کی حقیقت و ماہیت کیا ہے یہ سب مابعد الطبیعیاتی تجریدات ہیں۔ ان سے احتراز ہی مفید ہے، فلسفہ کا کام ظواہر کے باہمی تعلقات اور ان کے غیر متبدل طریق رفتار کا دریافت کرنا ہے نہ کہ تجریدی تصورات سے گورکھ دھندے

میں اُلجھنا !

کامٹ کی ساری دلچسپی عمرانیات سے تھی وہ اپنے کو اس علم کا موجد سمجھتا تھا ۔ اس کا نصب العین سوسائٹی کی اصلاح تھی ، اس نصب العین کا تحقق معاشرت کے قوانین کے علم ہی سے ہو سکتا ہے لہذا کامٹ معاشرت کا سائنٹفک طریقوں سے مُطالعہ کرنا چاہتا تھا اور اسی کو وہ " فلسفہ جدید قرار دیتا تھا ۔ اس لئے ایجابیت کا مطلب صرف اتنا ہوا کہ سائنس فکر انسانی کی آخری منزل ہے ، اور سائنس کا مقصد وحید واقعات تجربہ کے باہمی مستقل علایق اور انکے قوانین دریافت کرنا ہے ، اور یہ مشاہدہ اور تجربہ ہی سے ممکن ہے ، سائنس ان چیزوں سے بحث کرتی ہے جو یقینی مفید اور قطعی ہوتے ہیں اور خصوصاً جو ہمارے معاشری اداروں کی تکمیل کے لئے مفید ہوتے ہیں ، یہ علم ایجابی ہے ، اسی کی تدوین ایجابیت کا کام ہے

سائنس کی قدر و قیمت کے متعلق ہر شخص کا کامٹ کے ساتھ اتفاق ہوگا اور نہ ہر کسی کو علم معاشریہ کی اہمیت کے متعلق اعتراض ہو سکتا ہے ، لیکن کیا ہم اس کے اس خیال کے ساتھ اتفاق کر سکتے ہیں کہ فلسفہ کے وسیع مسائل کا مطالعہ فضول ہے اور مابعد الطبیعیات پر وقت صرف کرنا رائگاں ؟ اس کی تحقیق آگے آتی ہے

ارتیابیت

دوسرا گروہ جو ہمیں فلسفہ کی منزل مقصود کی طرف قدم اٹھانے سے باز رکھتا ہے وہ ارتیابیہ کا ہے ، خیام کی زبان میں کچھ اس طرح ہم اس مسلک کو ادا کر سکتے ہیں

دورے کہ دردآمدن و رفتنِ ماست — او را نہ نہایت و بدایت پیداست
کس می نزند دمے دریں معنی راست — کیں آمدن از کجا و رفتن بکجاست

ارتیابیت کا ظہور پہلے یونان میں سوفسطائیہ کے دور میں ہوا ۔ " غورجیاس کی تعلیم سفطہ " کا نمونہ ہے ۔ "کسی شئی کا وجود نہیں اگر وجود ہے تو ہمیں اس کا علم نہیں ؛ اگر اس کا علم بھی ہے تو یہ دوسروں تک نہیں پہونچایا جا سکتا " ہستی کا انکار ، علم کا انکار ، اس سے زیادہ انکار و ارتیاب کیا ہو سکتا ہے ؟ چند دن بعد یونانی رومی دور میں ارتیابیت فلسفہ کا ایک مستقل " اسکول " بنگئی جس کا بانی " پرہو " تھا ۔ تعجب تو یہ ہے کہ گو ان مفکرین نے سقراط ، افلاطون ، ارسطو ، دیمقراطیس جیسے جلیل القدر فلسفیوں کے بعد جنم لیا ، اور گو اہل یونان نے اب تک مابعد الطبیعیات اخلاقیات ، منطق ، ریاضیات میں شاندار کامیابیاں حاصل کی تھیں ۔ تاہم انہوں نے " بردِ تحمل " تک پہونچنے میں مایوسی کا اظہار کیا ۔ ان کا خیال تھا کہ اب تک فلسفہ ادعائی تھا ، ذہن انسانی نے ملکۂ علم کی تنقید کے بغیر یہ مان لیا تھا کہ حقیقت کا علم ممکن ہے ۔ لہذا یہ اکابر فلاسفہ کے مختلف و متضاد خیالات و نظریات کا ایک دوسرے سے مقابلہ کرتے اور ان کا مذاق اُڑایا کرتے اور کہتے کہ عقدۂ کائنات لاینحل ہے ، صداقت کلی ناقابل حصول ۔ ہاں

" انسان (فرد) ہر چیز کا معیار ہے" "جتنے آدمی اتنے ذہن" ہماری رائوں میں یکسانیت ممکن نہیں، لہٰذا علم کلی کا امکان بالکل نہیں - فرد علم کے معاملہ میں اپنا قانون آپ ہے، اس نظری ارتیابیت سے اخلاقی ارتیابیت بہت زیادہ دُور نہیں تھی - جب علم ہی کا امکان نہیں تو صواب و خطا کا علم کہاں، کلی طور پر صواب و خطا کا وجود نہیں، جو چیز تمھارے لئے اچھی ہو ضروری نہیں کہ وہ میرے لئے بھی اچھی ہو - ضمیر شخصی معاملہ ہے - یہی حال جمال کا ہے، اس میں بھی کوئی مشترک معیار نہیں - کیا تمھیں اس حبشی کا قصہ یاد نہیں جو اپنے بادشاہ کے اس حکم کی پیروی میں کہ سب سے زیادہ حسین بچے کے گلے میں موتیوں کا ہار پہنایا جائے بہت سی تلاش کے بعد اپنے ہی بچہ کے گلے میں پہنا دیا اور عرض کیا کہ جہاں پناہ میری نگاہ میں اس حبشی زادے سے زیادہ خوبصورت آپ کی ساری وسیع مملکت میں کوئی بچہ نہیں!"

(۱۷۱۱ء تا ۱۷۷۶ء) ـــــــ زمانہ جدید میں یونان کی سی ارتیابیت بالکل مفقود ہے - ارتیابیت کا سب سے آخری حامی اڈنبرا کا مشہور عالم مفکر ہیوم تھا - لیکن اس کی ارتیابیت ایسی تباہ کن اور انتہائی نہ تھی جیسی کہ یونانی ارتیابیت بلکہ حدودِ علم کی ایک ناقدانہ تحقیق و تدقیق تھی - جس کا نتیجہ یہ تھا کہ ہمارے علم کا مبدا تجربہ ہے، اس کی انتہا عالم مظاہر، اور ایک قسم کی "لا ادریت" کہ علل انتہائی، روح، الیغو وغیرہ کی حقیقت کے متعلق ہمیں کوئی علم نہیں

موجودہ زمانہ کی اسپرٹ تو یہ ہے کہ ہر جدید مسئلہ کا امیدورجا کے ساتھ بہم طور پر مقابلہ کیا جائے، فلسفیوں کا باہمی اختلاف ممکن، علم انسانی کی غلطی ممکن، ہمارے حواس کا التباس ممکن، لیکن ہم یہ ضرور دریافت کرکے رہیں گے کہ کونسا فلسفی صحیح ہے، حواس کا دھوکہ کس طرح دُور کیا جا سکتا ہے، علم کی غلطی کیسے رفع ہو سکتی ہے - زمانہ جدیدہ کی روح جرأت و جوش سے مملو ہے، قطب جنوبی کی دریافت کا بیڑا اٹھایا، تلاش میں جانیں گئیں - لیکن باوجود ہر طرح کے آفات و مصائب کے اس کو دریافت کر ہی لیا - مونٹ ایورسٹ کی چوٹیاں ابھی زیر قدم نہیں آئی ہیں - لیکن اہل ہمت اس کی طرف بڑھے جا رہے ہیں - ایک نہ ایک روز یہ زیرِ قدم آ رہیں گی - یونیورسٹی کی شرکت کے وقت طلباء ان مضامین کو زیادہ پسند کرتے ہیں - جن میں مسائل زیادہ دریافت طلب ہوں - موجودہ فکر و تفلسف میں شک ضرور پایا جاتا ہے - لیکن یہ ہمیں لوری دے کر بستر راحت پر نہیں سلا رہا ہے بلکہ اقبال کی زبان میں کہہ رہا ہے ؎

ضمیر کن فکاں غیر از تو کس نیست — نشانِ بے نشاں غیر از تو کس نیست
قدم بیباک تر نہ در رہِ زیست — بہ پہنائے جہاں غیر از تو کس نیست!

براؤننگ کہتا ہے کہ "شک کی میں قدر کرتا ہوں، حیوانات میں یہ نہیں پایا جاتا، ان کی محدودیت میں اس شعاع مستنیر کی تابناکیاں کہاں؟" برٹرنڈ رسل اس رہاکن و آزادی بخش "شک" کا ذکر کرتا ہے جو ادعائیت کو پست ہمت کرتا اور ہمیں راہ عمل میں جری بناتا ہے - وہ کہتا ہے کہ "فلسفہ ان لوگوں کی متکبرانہ ادعائیت کو دور کرتا ہے جو آزادی بخش شک کے دائرہ میں قدم زن ہوتے ہیں، یہ مانوس اشیاء کو غیر مانوسیت کے جامہ میں پیش کرکے ہمارے احساس تحیر

کو ہمیشہ زندہ رکھتا ہے" ان جری روحوں کو ان بزدلوں سے کسی قسم کی ہمدردی نہیں ہو سکتی جو محض اس خیال سے کہ چونکہ فلسفیانہ سوالات کے جواب نہیں دئے جا سکتے لہٰذا ان کو اٹھایا ہی نہ جائے اور نہ ان کے حل کی کوشش کی جائے فلسفہ کی راہ میں طالب علم کو شک بلکہ دہشت ہوتی ہے ضرور، لیکن شک کا پیدا کرنا، صداقت کی تلاش میں آوارہ و سرگرداں ہونا اور اس کے حصول کی اُمید رکھنا ——— یہ روحِ انسانی کا عظیم الشان کارنامہ ہے!

ان دنوں ہم ارتیابیت کی بجائے "لاادریت" کا زیادہ ذکر سنتے ہیں۔ اس لفظ کو سب سے پہلے ہکسلی نے رواج دیا لیکن یہ ہربرٹ اسپنسر کے نام سے زیادہ وابستہ ہے اس کے لفظی معنی ہیں "علم کا نہ ہونا" لاادری، یعنی میں نہیں جانتا۔ اسپنسر کا یقین تھا کہ علم میں ایک قسم کی اضافیت پائی جاتی ہے، لہٰذا علمِ مطلق کا امکان نہیں سارا علم اضافی ہے قانونِ اضافیت کے معنی یہ ہیں کہ کسی شئے کا علم دوسرے خارجی اشیاء کے امتیاز سے حاصل ہوتا ہے جو اس کی تحدید کرتے ہیں، نیز یہ شئے ذہن کی اضافت ہی سے معلوم ہو سکتی ہے، اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ ہمیں مظاہری، محدود، اضافی اور مشروط موجودات کا علم ہوگا، لامحدود اور مطلق یا غیر مشروط ہمارے دائرہ علم سے ماورا، غیر معلوم و ناقابل علم ہوگا۔ چنانچہ اسپنسر کے نزدیک ہمارا علم مادہ حرکت قوت اور شعور وغیرہ جیسے واقعات کے ماورا نہیں پہونچ سکتا اور یہ تمام ایک "ناقابل علم ہستی مطلق" کے شئون و احوال ہیں

قانونِ اضافیت پر تھوڑی دیر کے لئے غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ قانون خود ذات مطلق کے تصور کو ضروری سمجھتا ہے، یعنی اضافی کے تصور میں مطلق کا تصور استلزامی طور پر موجود ہوتا ہے اور خود ہربرٹ اسپنسر نے اس کو تسلیم کر لیا ہے، صاف ظاہر ہے کہ اگر دنیا محض ظہور ہے تو یہ ضرور کسی ہستی کا ظہور ہوگی، ظہور خود حدِ اضافی ہے جو کسی مطلق ہستی کے وجود کو مستلزم ہے، اسپنسر کا کہنا صرف یہ تھا کہ مطلق کے وجود کے سوا ہمیں اس کے متعلق کسی شئے کا علم نہیں، لیکن اسپنسر کی اس غلطی کو ہیگل نے پہلے ہی رفع کر دیا تھا۔ چونکہ تمام محدود اشیاء و اذہان مطلق کے ظہور ہیں لہٰذا وہ ان ہی میں اور ان ہی کے ذریعہ قابل علم ہے، اس میں شک نہیں کہ مطلق کی ماہیت ہمارے محدود ذہن میں پوری طرح نہیں آسکتی لیکن ہمیں اس کو ایک حد تک ضرور جزوی طور پر سمجھ سکتے ہیں اور اس کے کچھ صفات سے واقف ہو سکتے ہیں۔ لہٰذا لاادریت کا یہ دعویٰ کہ جس قسم کے علم کی فلسفہ کو تلاش ہے وہ ناقابل حصول ہے، شک سے بڑھ کر ادعائیت کی حد تک پہونچ جاتا ہے، لہٰذا یہ سائنس اور فلسفہ ہر دو کی اسپرٹ کے خلاف ہے جو اَن تھک اور دائمی تلاش کا نام ہے، فلسفی یا "عاشق حکمت" "آزارِ جستجو" ہی کو اپنی غائت سمجھتا ہے اور اقبال کی زبان میں کہتا ہے ؎

شادم کہ عاشقاں را سوزِ دوام دادی
درماں نیافریدی آزارِ جستجو را

اور "در قلزم آرمیدن ننگ است آبجو را" کہتا ہوا "رمزِ کائنات" کا ہمیشہ جویا و متلاشی رہتا ہے!

فلسفیانہ نقطۂ نظر کی ضرورت:-

سچ تو یہ ہے کہ آج سے دو ہزار سال سے بھی زیادہ پہلے ارسطو نے اس بحث کا تصفیہ کر دیا تھا کہ آیا ہم فلسفہ کا مطالعہ کریں یا نہ کریں، اس نے کہا تھا کہ " ہم فلسفیانہ غور و فکر کریں یا نہ کریں، ہمیں فلسفیانہ غور و فکر کرنا تو ضرور پڑتا ہے "۔ شوپنہار نے انسان کی طبیعت کا پتہ لگا کر اسی لئے کہا تھا کہ انسان " مابعد الطبیعیاتی حیوان ہے " اوڈن والس نے نہایت عقلمندی سے کہا تھا کہ " ہر شخص خواہ شعوری طور پر ہو یا غیر شعوری طور فرد و کائنات کے رشتہ باہمی کے متعلق کوئی نہ کوئی نظریہ ضرور قائم کر لیتا ہے اور اسی پر اس کی ساری زندگی و عمل کا انحصار ہوتا ہے " اسی خیال کو پالسن نے یوں ادا کیا ہے کہ ہر شخص کا فلسفہ ہوتا ہے - عہد فطرت میں بسنے والے وحشی کا یہی فلسفہ ہوتا ہے اور یہی اس کے اعمال و کردار کا مرکز ہوتا ہے ! اور اسی معنی کے لحاظ سے چسٹرٹن کہتا ہے کہ " آدمی میں سب سے زیادہ اہم اور سب سے زیادہ عملی چیز کائنات کے متعلق اس کا نقطۂ نظر ہے " یعنی اس کا فلسفہ !

آپ نے اوپر دیکھا تھا کہ فلسفی کائنات کی ماہیئت و غائت کے متعلق ایک نظریہ حاصل کرنا چاہتا ہے - عالم سائنس کے کمی علم کی تکمیل کیفی علم سے کرنا چاہتا ہے - اس کو چند ایسے مفروضات تسلیم کرنا پڑتے ہیں جن کی تصدیق بالکلیہ تجربہ و مشاہدہ و اختیار سے نہیں ہو سکتی - حواس جن چیزوں کی شہادت دیتے ہیں ان کی تکمیل وہ تخیل یا وجدان سے کرتا ہے یہ ضروری نہیں کہ وہ اپنی مرضی یا ارادہ ہی سے ایسا کرے بلکہ بقول ارسطو خواہی نخواہی اس کو کرنا پڑتا ہے، وہ کامٹ کی طرح اپنے کو " ایجابی " کہہ سکتا ہے اور احتجاج کر سکتا ہے کہ وہ صرف واقعات ہی کی حد تک محدود رہنا چاہتا ہے یا اسپنسر کی طرح وہ کہہ سکتا ہے کہ وہ " لا ادریہ " ہے اور اشیا، کماہی کے علم سے نا واقف، لیکن وہ ان احتجاجات کے باوجود چند مفروضات کو تسلیم کرتا ہے اور خواہی نخواہی فلسفی ضرور ہے، ھذا شئی عجاب ! بڑے سے بڑا " لا ادری " بڑے سے بڑا شکی، یا ارتیابی، اپنے عقائد و انکارات مخفی نہیں رکھ سکتا، اس کو زندگی کے کارزار میں جانب داری کرنی پڑتی ہے - باوجود ایجابیت و لا ادریت کی لن ترانیوں کے، باوجود ما درائی غنان سے اس امر کا یقین دلانے کے کہ حقیقت نا قابلِ علم ہے اس کو زندگی اس طرح بسر کرنی پڑتی ہے گویا کہ اس نے ان خوفناک استبعادات کے ایک نہ ایک پہلو کو قبول کر لیا ہے جن پر فلسفہ مشتمل ہوتا ہے - اس کو اس امر کا تصفیہ کر لینا پڑتا ہے کہ آیا یہ زمین جس پر اس کی زندگی بسر ہو رہی ہے ایک ذی غائت عقل کی صنعت گری کا نتیجہ ہے یا ذرات یا سالمات کی کورانہ کشمکش کا آفریدہ یعنی خدا کے متعلق اس کا کوئی نہ کوئی نظریہ ہونا چاہیئے خواہ یہ خدا کے وجود کے انکار ہی کی خاطر کیوں نہ ہو - اس کو اپنے ذہن میں اس امر کا تصفیہ کر لینا چاہیئے کہ آیا وہ ایک خود رفتار مشین بالکل ہے جو دوسری مشین سے ہم صحبت ہوتا ہے تاکہ چھوٹے مشین پیدا ہوں یا ایک قوتِ حیات کا ظہور، تخلیقی قوت و اختیار کا حامل یا نورِ الٰہی کی گریز پا شعاع ! اس کو اپنے ذہن میں اس امر کا بھی فیصلہ کر لینا چاہیئے کہ آیا عقل کی غیر یقینی قوتیں یا وجدان کی شاہانہ بداہت حقیقت کی رہنما اور

صداقت کا معیار ہے۔ اسی طرح اخلاقی اقدار کے متعلق، اس کو اس امر کا تصفیہ کر لینا چاہئے کہ وہ اپنی بیوی کے ساتھ وفادار رہے گا یا اپنی قوتِ مردانگی کو قیمتی طور پر تقسیم کرے گا! اس کو اپنے نزدیک اس امر کا فیصلہ کر لینا چاہئے کہ آیا مرنے کے بعد اس کا بالکل خاتمہ ہو جاتا ہے "خاکی است و بخاکش ہمی دہند" یا "چو دانہ خاک شگافد گل تراست" ایک اعلےٰ وارفع زندگی میں داخل ہوتا ہے!

یہ تمام نہایت اہم مسائل ہیں اور فلسفہ موت وحیات کا معاملہ ہے اور ان تمام مسائل کے متعلق فلسفے کا کٹر سے کٹر مخالف اپنے ذہن میں کچھ نہ کچھ فیصلہ کر لیتا ہوتا ہے مثلاً وہ فرض کر لیتا ہے کہ مادیت صحیح ہے، حقیقت کی تمام صورتیں نجر و حجر، لطف و کرم دعا و عبادت —— سب مادی ہیں، ان کی مادی پیمائش ہو سکتی ہے۔ یہ ایک شاندار مفروضہ ہے جس کی اختیاری تصدیق بالکل ناممکن، یہی مفروضہ اس کو فلسفی بناتا ہے اور اپنے اس فلسفہ کو وہ قابلِ تعریف سادگی کے ساتھ پیش کرتا ہے۔ وہ فرض کر لیتا ہے کہ دنیا ایک قسم کی میکانیت ہے، اور وہ خود ایک مشین ہے جو میکانکی اور غیر شعوری طور پر شعور کے زاید از ضرورت اور فضول ارتقا پر غور کر رہا ہے، دنیا کی ماہیت کے متعلق یہ بھی ایک نظریہ ہے جو آب تک ناقابلِ ثبوت ہے، اور جب اس کو دیمقراطیس، یا لکریٹیس یا ہابس یا لامتری پیش کرتے ہیں تو فلسفہ کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ وہ تسلیم کرتا ہے کہ حیات میں خود اختیاری نہیں، ہر ایک ہستی کا ہر فعل اس ابتدائی ضبابہ (Nebula) نے متعین و مقرر کر دیا ہے جو سائنس کی ضمنیات میں "باغ عدن" کی جگہ ہماری سامعہ نوازی کرتا ہے۔ وہ تسلیم کرتا ہے کہ ذہن مادہ ہے اور بقول د باستنا دینتے (نعوذ باللہ) خدا ایک عرصہ ہوا کہ مر چکا اور اس کی متعدد قبریں مساجد و منادر میں بنائی جا چکیں!

یہ سب ممکنہ مفروضات ہیں۔ ہر فلسفی ان کو یا ان مخالف مفروضات کو تسلیم کرنے کا حق رکھتا ہے۔ ہم تمام کو ان مفروضات کو تشکیل دینا اور ان کو تسلیم کرنا پڑتا ہے۔ زندگی ہمیں مجبور کرتی ہے کہ ہم اشیاء کی ماہیت اور انسان کی غایت کے متعلق مفروضات کو تسلیم کریں، ہم ہمیشہ مفروضات کی تشکیل میں حصہ لیتے ہیں، مطلق کا "آزارِ جستجو" ہمارا "آرامِ جان" ہوتا ہے، اس کی دلکشی ہمیں ہمیشہ اپنی طرف جذب کرتی ہے۔ علاوہ دوسرے وجوہات کے یہ بھی ایک وجہ ہے کہ فلسفہ سائنس سے زیادہ دلچسپ اور دلکش ہوتا ہے، وہ دیارِ نامعلوم کا سفر ہے۔ لامحدود کی تلاش میں کو بکو کوچہ بکوچہ سرگرداں ہوتا ہے، اس کے مقابلہ میں سائنس کی دلچسپی ضرب کی تختی میں جو دل فریبی ہے اس سے زیادہ نہیں!

لہٰذا ہم سب فلسفی ہیں، مابعد الطبعیاتی حیوان ہیں، ایک جو اعلاناً فلسفی ہے دوسرا جو اقراراً ایجابی ہے ان دونوں میں فرق صرف اتنا ہے کہ اول الذکر ہی اس معاملہ میں راست باز و راست گو آدمی ہے

فلسفہ کی ترقی پہ اعتراض :-

فلسفہ پر ایک اعتراض عام طور سے یہ کیا جاتا ہے کہ فلسفیانہ مباحث میں جس دروازے سے ہم داخل ہوتے ہیں،

اسی دروازے سے باہر بھی ہوتے ہیں، ہر فلسفی دوسرے فلسفی کے خیالات کا نقیض پیش کرتا ہے، تاریخ فلسفہ ان ہی متناقضات و نظری آراء کا مجموعہ ہے جو کامیابی کے لحاظ سے مادی علوم مخصوصہ کی ترقی سے کسی طرح مقابلہ نہیں کر سکتی

حقیقت میں فلسفیانہ مباحث کے دوران میں یا تاریخ فلسفہ کے مطالعہ کے وقت اگر ہم اپنا دماغ دروازہ کے باہر چھوڑ کر جائیں تو بیشک اسی دروازہ سے نکل آئیں گے جس دروازے سے کہ ہم داخل ہوئے تھے! اکابر فلاسفہ کا سرسری مطالعہ کرنے کے بعد بھی ہزار ہا اہم مسائل کے متعلق ہم اپنے خیالات بدلے بغیر رہ نہیں سکتے۔ ہم خود فلاسفہ کے متناقضات کے متعلق بھی اپنی رائے بدلنے پر مجبور ہوں گے اور پائیں گے کہ بنیادی مسائل کے متعلق تقریباً تمام اکابر فلاسفہ کا اتفاق تھا، اختلافات محض اپنے اپنے زمانہ کے اصطلاحات و حدود کے فرق کی وجہ سے دکھائی دیتے ہیں۔ اور نیز اگر ہم تاریخ سائنس کے طالب علم ہیں تو ہمیں بادی النظر ہی میں یہ معلوم ہو جائے گا کہ فلسفہ سے زیادہ سائنس میں نظریات ...... اعتقادات سینما کے متحرک تصاویر کی طرح بدلتے رہتے ہیں۔ سائنس کی تاریخ ہزار ہا مسترد نظریات کی تاریخ ہے۔ مثال کے طور پر، ہم چند عالمگیر اہمیت کے نظریات کا ذکر کریں گے:۔

آج سے پچاس پچپن سال پہلے کائنات کے ابتدائی توجیہ لاپلاس کے مفروضہ ضبابیہ "Nebula Hypothesis" سے کیجاتی تھی۔ کانٹ فلسفی نے اس نظریہ کو سب سے پہلے پیش کیا تھا، لاپلاس نے اس کی توضیح کی تھی، آج کل شکاگو یونیورسٹی کے پروفیسر چیمبرلین اور مولٹن نے اس کی توجیہہ "Planetesinal Hypothesis" پیش کی ہے جو اول الذکر نظریہ کی تردید کرتی ہے

پچاس پچپن سال پہلے ڈارون کی "Origin of speceees" (اصل انواع) ارتقائی انجیل سمجھی جاتی تھی آج کل یہ دنیا بھر کے اعتراضات کا نشانہ ہے اور اس کی وقعت کا حال سب کو معلوم ہے! عمل ارتقائی توجیہ تغیرات "Variation" کے بجائے "تحولات" (mutation) سے ہونے لگی، اب مسٹر کیامریر کے ساتھ ہم لامارک کے نظریہ کو پھر قبول کرنے لگے ہیں۔ ہمیں تفاوت راہ! نیوٹن نے حرکت کے بعض قوانین بنائے دنیائے سائنس نے ان کو قبول کیا، اب آئنسٹائین ان کی تردید کر رہا ہے۔ ٹے ير، رم فورڈ، ڈے وی، اور صدہا دیگر علماء سائنس نے مادہ کی غیر فنا پذیری اور بقائے توانائی کو ثابت کیا اور ساڈی رذر فورڈ بینکاریے جدید سائنس کے ان انتہائی عقاید میں شک پیدا کر رہے ہیں۔ پیرسن، ماخ وغیرہ ہم سے کہہ رہے ہیں کہ سائنس کا علم تخمینی احتمالات کا موجز بیاں ہے، اور فطرت کے عدیم التغیر وابدی قوانین مادہ کے مشاہدہ کردہ عادات کے اوسط کے سوا کچھ اور نہیں! بھلا ہم ایسی سائنس کی شان میں کیا کہیں جو فلسفہ کی طرح غیر یقینی ہو گئی ہے اور فطرت کے علم کا کیا دعویٰ کریں جس کے قوانین اعداد و شمار کی سی وقعت رکھتے ہوں! کسی زمانہ میں ریاضیات کو متیقن اور غیر خطا پذیر صداقتوں کا مجموعہ سمجھا جاتا تھا کہ ناگہاں ابعاد ثلثہ صاحب اولاد ہو گئے، جزء کل کے اتنا بڑا ہو گیا اور آئنسٹائین نے ثابت کر دیا کہ

دو نقاط کے درمیان ایک خطِ مستقیم بڑے سے بڑا فاصلہ ہے! فرانسس گالٹن اور کارل پیرسن کی تحقیقات کی رُو سے ماحول کا اثر توارث سے زیادہ تھا .... مسٹر ڈگم نے اس کے برخلاف بڑی شان سے دنیا کو یہ ثابت کر دکھلایا کہ توارث کا اثر ماحول کے اثر سے زیادہ ہے،، اب ڈاکٹر واٹسن دو سو بچوں کا معائنہ کرنے کے بعد ہمیں اطلاع دے رہے ہیں کہ جنین اور بچہ کا ماحول اس کی سیرت در تاریخ کے تعین کا اہم جز ہے اور توارث کا اثر نہایت خفی ہے اور آسانی سے نظر انداز کیا جا سکتا ہے - آئے دن ہر ایمان دار تاریخ داں ثابت کر رہا ہے کہ تاریخ " جھوٹ کا دریا ہے ہر ایمان دار " Egyptologist " سنین و سلسلہ ملوک کی ایک نئی فہرست پیش کرتا ہے جو دوسری فہرستوں سے چند ہی ہزار سال کا فرق رکھتی ہے!

سائنس کے نظریات کے عدیم التغیر ہونے کے ثبوت میں یہ مثالیں اہلِ بصیرت کے لئے کافی ہیں، اعمال نامے کو طول دینے کی ضرورت نہیں، فلسفی کی نظروں کے لئے تو یہ خوش کن سرکس ہے! بحیثیت فلسفی ہمیں اعتراف ہے کہ فلسفہ بعض جگہ تاریک ہے لیکن یہی حال شیلی کی نظم کا ہے، یہی حال سائنس کا ہے، یہی حال جنس لطیف کا ہے، یہی حال ہر دلچسپ شے کا ہے! اس سے بدتر، ہم ماننے پر تیار ہیں کہ فلسفہ بعض دفعہ کذاب بھی ہے - ہم اپنے قلب کے عزیز تعصبات کو، بڑھی عورتوں کی دینیات کو خارجی یقینی عقل کے لباس میں ملبوس کرتے ہیں - اسی بنا پر ایک مشہور فلسفی براڈلے نے مابعد الطبیعیات کی اس طرح تعریف کی ہے کہ " مابعد الطبیعیات (فلسفہ) ان چیزوں کے لئے جن میں ہم جبلّی طور پر یقین کرتے ہیں خراب حجتوں کا دریافت کرنا ہے، لیکن ان حجتوں کا دریافت کرنا بھی کچھ کم جبلی نہیں " لیکن باوجود ان تمام نقائص و خرابیوں کے سائنس کی طرح فلسفہ کی رفتارِ ترقی بھی متعین اور شاندار ہے، گزشتہ پچیس سال میں فلسفہ نے اسی سرعت و شان کے ساتھ ترقی کی ہے جس طرح کہ سائنس نے - ولیم جیمس جیسے محتاط و منصف فلسفی کے الفاظ میں، ہم کہہ سکتے ہیں کہ :-

" بعض حیثیتوں کے لحاظ سے تو " سائنس " نے " فلسفہ " سے کم ترقی کی ہے - یعنی اس کے اکثر کلی تصورات سے نہ ارسطو کو حیرت ہوگی اور نہ دیکارٹ کو اگر بفرض محال انھوں نے زمین کی سیر کا ارادہ کیا - اشیاء کا عناصر سے مرکب ہونا، انکار ارتقا، بقائے توانائی، ایک کلی لزوم یا جبر کا تصور، یہ سب انھیں معلوم و معتاد چیزیں نظر آئیں گی - ہاں چھوٹی موٹی چیزیں مثلاً خوردبین، بجلی کی روشنی، ٹیلیفون، اور سائنس کی دیگر جزئیات ان کو ضرور مرعوب کریں گی - لیکن اگر یہ ہمارے مابعد الطبیعیات کی کتابیں کھولیں یا فلسفہ کے لکچر روم میں آئیں تو ہر چیز انھیں اجنبی سی معلوم ہوگی - ہمارے زمانہ کا سارا " تصوری " یا " انتقادی " پہلو انھیں نیا معلوم ہوگا اور ان کے سمجھنے میں انھیں دیر لگے گی " (بعض مسائل فلسفہ ص ۲۴)

شاید اس تفصیلی بحث کے بعد آپ کو فلسفیانہ تعلیم کے فوائد کا بھی اندازہ ہو گیا ہوگا - فلسفہ آپ کو سب سے پہلے وحدت

وہی عطا کرتا ہے، ہم آپ سب فکر کے عمل میں غیر محتاط اور متناقض ہوتے ہیں ہمیں کسی حد تک توافق و وفاق کی ضرورت ہے - فلسفیانہ تعلیم ہمیں وحدتِ فکر بخشتی ہے، اس وحدتِ ذہن یا وحدتِ فکر سے ہمارے خواہشات میں وحدت پیدا ہوتی ہے، اور اس کی وجہ سے سیرت میں وحدت پیدا ہوتی ہے جو شخصیت کا دوسرا نام ہے اور سیرت کی وحدت کی وجہ سے زندگی میں وحدت پیدا ہوتی ہے جو مسرت کا راز ہے اور جو ہم سے تماموں کی غایت قصوی ہے - اپکیورس شہنشاہِ خوش باشاں نے دو ہزار سال قبل اپنے ایک دوست کو خط لکھا تھا جس میں وہ کہتا ہے

"کسی شخص کو بھی جب تک وہ جوان ہے فلسفیانہ تعلیم حاصل کرنے میں دیر نہ کرنی چاہئے، اور اگر وہ ضعیف ہے تو اس کو اس تعلیم کے حصول میں تھکن نہ ظاہر کرنی چاہئے، کیونکہ وہ کون شخص ہے جو اپنی روح کی صحت کا علم حاصل کرنے میں وقت کی موزونیت و ناموزونیت و تاخیر کا خیال کرے گا؟ اور جو شخص یہ کہتا ہو کہ فلسفہ سیکھنے کا ابھی وقت نہیں یا وہ وقت گزر چکا، تو اس کی مثال اس شخص کی سی ہے جو یہ کہتا ہو کہ ابھی مسرت کا وقت نہیں آیا یا وہ گزر گیا!"

فلسفیانہ تعلیم سے انسان اپنی جذبات کی غلامی سے آزاد ہوتا ہے، جذبات کی غلامی سے آزادی حاصل کر کے دوسروں کی غلامی سے نجات پاتا ہے - روما کے ایک جادو بیان کے الفاظ میں ہم فلسفہ کو مخاطب کر کے کہہ سکتے ہیں:-

"اے فلسفہ کی روح، اے ہماری زندگی کی رہنما، نیکی کی دوست اور بدی کی دشمن، تیرے بغیر ہم کیا اور ہماری زندگی کیا!"

میر ولی الدین ایم - اے (جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن)

اولی الالباب سے خطاب

جناب مولوی سعید الدین صاحب ام - اے - ال ال بی سب جج بریلی کا وہ مشہور رسالہ جو کئی سال قبل شائع ہو کر ہاتھوں ہاتھ نکل گیا - اس میں صاحب موصوف نے قرآن کی اہمیت اور اس کو سمجھ کر پڑھنے پر نہایت دلکش انداز میں روشنی ڈالی ہے --- اس کا مطالعہ خواتین کے لئے از بس ضروری ہے --- ۵ کے ٹکٹ بھیج کر حاصل کیجئے

منیجر نگار لکھنؤ

رجونتی

یوں تو برسات کی ہر شام خوشگوار ہوتی ہے لیکن جب کئی روز تک مسلسل بارش ہونے کے بعد فطرت کا جوش کچھ کم ہوتا ہے تو کھیتوں اور میدانوں کی کشش دونی ہو جاتی ہے، درخت اور پودے نہا دھو کر نیا روپ اختیار کر لیتے ہیں اور شام کی تابناک شفق ہر چیز کو اپنے ساحرانہ لمس سے زرکار بنا جاتی ہے

سئی ندی کے کنارے کشن پور کے علاوہ اور بھی کئی گاؤں آباد تھے ۔ اور دوسری جانب مقابل میں رسول آباد کا بازار تھا، جہاں دوشنبہ اور جمعہ کو جب خاص طور پر بازار لگتا تھا اچھی خاصی چہل پہل ہو جاتی تھی، ــــ برسات کے علاوہ ہر موسم میں دریا اس قدر پایاب رہتا تھا کہ لوگ آسانی سے ادھر اُدھر آجا سکتے تھے البتہ جب بارش ہوتی تو سئی ندی میں چھوٹی چھوٹی کشتیاں چلنے لگتیں

کشن پور میں سیتل اور شنکر دو ملاحوں کے مکان تھے، مچھلیوں کے علاوہ برسات میں یوں بھی کچھ آمدنی ہو جاتی تھی، شنکر کے کئی لڑکے اور لڑکیاں تھیں جنمیں سرجو سب سے بڑا تھا اس کی عمر اکیس سال کے قریب تھی اس کی شادی ابھی کہیں نہیں ہوئی تھی کیونکہ قرب و جوار میں کسی اور ملاح کا مکان ہی نہ تھا، سیتل کے صرف ایک لڑکی رجونتی تھی جس کی عمر سولہ یا سترہ برس کے قریب تھی سیتل اور شنکر ماجھی نے تو خیر آپس میں طے ہی کر لیا تھا لیکن عام طور پر بھی سارے گاؤں میں یہ خبر مشہور تھی کہ سیتل ماجھی کی کنول جیسی خوبصورت لڑکی کا بیاہ سرجو کے ساتھ ہوگا - سرجو اپنے کام میں بہت ہوشیار تھا لیکن رجونتی اور زیادہ قابل ستائش تھی کہ ماں کے مرنے کے بعد ہی گھر کا سارا کاروبار اس نے سنبھال لیا تھا - چھوٹے چھوٹے گاؤں میں ہر شخص کسی نہ کسی خاص بات میں ایک امتیازی شان رکھتا ہے؛ اور چونکہ لوگ کم ہوتے ہیں - اس لئے ہر شخص ایک دوسرے سے اچھی طرح واقف ہوتا ہے - سرجو بہت ہونہار اور محنتی لڑکا سمجھا جاتا تھا - اور رجونتی بھی فراوانیٔ حسن کے ساتھ ساتھ فرمانبرداری کا اعلیٰ نمونہ خیال کی جاتی تھی

کئی دن تک مسلسل بارش ہوتی رہی اور لوگ گھر پر پڑے پڑے کاہلی اور سستی محسوس کرنے لگے، علاوہ اُن لوگوں کے جن کی ضرورتیں نہایت اہم تھیں تمام لوگوں نے اپنا اپنا کام بارش کے بند ہو جانے پر اٹھا رکھا تھا، سنیچر کے روز سے پانی برسنا شروع ہوا تھا گاؤں کے بڑے بوڑھوں نے نہایت سنجیدگی اور یقین کے ساتھ حکیمانہ انداز

میں پیشینگوئی کردی تھی کہ پانی سنیچر کے پہلے بند ہو ہی نہیں سکتا۔ ..... اور ہوا بھی یہی! جب لوگ اتوار کی صبح کو سو کر اٹھے تو آسمان صاف تھا اور یہ معلوم ہو رہا تھا کہ کوئی حسین دوشیزہ بڑی التجاؤں کے بعد نقاب اٹھا کر مسکرا رہی ہے

سیتل کئی روز سے بیمار تھا اُس کا ارادہ تھا کہ وہ کشتی نہ کھوے گا لیکن دوشنبہ کے دن اس قدر زیادہ لوگ رسول آباد بازار جانے کو تیار ہوئے کہ اس نے رجونتی کو بُلا کر کہا۔ "میرے کوئی بیٹا ہوتا تو آج میں بھی اطمینان سے بیٹھتا۔ آج آمدنی کی بہت امید ہے اور میرے بازؤں میں دریا کی موجوں سے لڑنے کی قوت نہیں، دو چار کھیوے تو ہی اُس پار پہونچا دے میں آج کل تیرے بیاہ کے لئے کوڑی کوڑی جمع کر رہا ہوں" رجونتی نے سر جھکا لیا اور چلی گئی اس نے ایک منٹ وقت بھی ضایع نہ کیا، باپ کے لئے تھوڑا بہت کھانا تیار کر کے وہ گھاٹ کی طرف روانہ ہو گئی

رجونتی کو بانسری بجانے سے بڑا اُنس تھا، اور اُس کی فرصت کے لمحے اسی مشغلہ میں صرف ہوتے تھے، بانسری اُس کی زندگی کا ایک جزو بن گئی تھی، وہ اکثر شام کے وقت سئی کی رنگین لہروں پر اپنی کشتی تیرا دیتی اور بانسری کے نغموں سے شام کی غمگینی کو طرب ناک بنا دیتی، ہوا میں سکون ہوتا اور کشتی کے ہلکے ہلکے ہچکولوں سے دریا میں چھوٹی چھوٹی موجیں اٹھتی تھیں تو یہ معلوم ہوتا تھا کہ رجونتی کے گیت سطح آب پر رقص کر رہے ہیں، اندھیری رات میں تو کم مگر شب ماہ میں اکثر مشتاق کان رجونتی کے گیتوں سے محظوظ ہوتے تھے، سرجو بھی کبھی کبھی کشتی میں بیٹھ کر اُسی وقت دریا میں تفریحاً نکلتا تھا اور اکثر دبی زبان سے یہ بھی کہہ دیتا تھا

"رجون! ہمیں تمہارے گیت بہت بھلے معلوم ہوتے ہیں" اس جملہ میں نہ جانے کس قدر ہمت افزا اثر ہوتا کہ رجونتی اور زیادہ انہماک سے بانسری بجاتی اور اپنے سب سے زیادہ مسحور کُن گیت گاتی

باپ کے کہنے کے مطابق رجونتی نے کشتی کھولی اور بہت سے لوگوں کو رسول آباد پہونچا آئی جب تک لوگ بازار کی خرید و فروخت میں مشغول تھے رجونتی اپنی کشتی میں بیٹھی ہوئی اُس کا پانی جو تختوں کے اندر سے آگیا تھا نکال کر باہر پھینکتی رہی، سئی ندی سے ایک نالا نکل کر گاؤں کے اندر ہی کچھ دُور تک چلا گیا تھا، اُسی پر ایک پُل بنا ہوا تھا جس پر شام کے وقت لوگ تفریح کی غرض سے آتے تھے، بازار کی مشغولیت کی وجہ سے سوا دو چار بچوں اور لڑکوں کے پُل پر کوئی نہ تھا کہ یکایک کسی چیز کے پانی میں گرنے کی آواز آئی، بازار میں کافی شور و غل تھا اور یہ آواز کسی کو اپنی جانب توجہ نہ کر سکی، چھوٹے لڑکوں نے شور مچانا شروع کیا کچھ لوگ دوڑ پڑے لیکن سب سے پہلے جو شخص دریا کے بہاؤ میں تیرتا ہوا نظر آیا وہ ایک عورت تھی۔ برسات کی وجہ سے نالے میں بہت زور تھا۔ لیکن رجونتی نے کچھ

ہی دُور پر لڑکے کو پانی کی متلاطم موجوں سے چھڑا لیا اور اطمینان سے پیرتی ہوئی کنارے پہونچ آئی بچے کے پانی میں گرنے کی خبر بات کی بات میں رسول آباد کے گوشے گوشے میں گونج گئی، پردہ نشین ماؤں نے گھر کے اندر اور دروازوں کی آڑ سے اپنے بچوں کا جائزہ لیا، باہر نکلنے والی عورتیں چشم زدن میں پُل پر جمع ہو گئیں، لڑکے کا باپ مہادیو اور بڑا بھائی کوشل بھی پہونچ گئے، لڑکے کی حالت خطرناک نہ تھی صرف غشی طاری تھی جو دو تین دیہاتی ترکیبوں سے جاتی رہی۔ جب بچے کی حیات کی طرف سے اطمینان ہو گیا تو لوگ رجونتی کی طرف مخاطب ہوئے۔ وہ ایک سیاہ ساری میں لپٹی ہوئی خاموش کھڑی تھی۔ اس کے سیاہ بال حسین چہرے پر بکھرے تھے، اس کا لباس پانی میں تر ہو کر اُس کے جسم سے لپٹ گیا تھا اور اُس کے تناسب اعضاء کو اور نمایاں کر رہا تھا۔ سارا بازار ٹوٹ پڑا تھا اور سب اسی کو دیکھ رہے تھے، وہ ساکت کھڑی تھی۔ اور سیکڑوں نگاہیں، استفسارانہ انداز میں اُس پر پڑ رہی تھیں، لوگوں کے دو چار سوالات کا جواب دیکر رجونتی اپنی کشتی کی طرف چل دی، مجمع کا ایک حصّہ اس کے ساتھ ساتھ وہاں تک بھی گیا، اس نے اپنی ساری کا پلو نچوڑا اور کشتی میں لوگوں کی نگاہوں کا مرکز بن کر بیٹھ گئی، اُس کی شہرت میں اضافہ ہو گیا، کسی نے اس کی ہمت کی تعریف کی، کسی نے اس کی قوت کو سراہا، کسی نے اس کی پیراکی پسند کی، لیکن ان سب سے زیادہ لطیف اور مؤثر وہ ادا تھی جس کی دیکھنے والی صرف ایک نگاہ اور جس سے متاثر ہونے والا ایک ہی دل تھا

ہر ایک نے رجونتی کو اس لئے دیکھا کہ وہ عورت ہو کر اس قدر ہمت دکھا سکی لیکن کوشل نے اُسے اس لئے دیکھا کہ اس کی نگاہوں نے حُسن و نسائیت کا اتنا مکمل امتزاج کبھی نہ دیکھا تھا۔ لوگوں نے اُسے تحیر کی نگاہوں سے دیکھا لیکن کوشل نے اُسے اپنی نگاہوں میں جذب کر لینے کے لئے دیکھا، لوگوں نے اُسے ظاہری نگاہوں سے دیکھا اور شام ہونے کے پہلے ہی چلے گئے لیکن کوشل دریا کے کنارے پر کھڑا ہوا کشتی کے چلے جانے کے بعد تک اسے دیکھتا رہا، دیکھنے والوں نے دو گھنٹے بعد اُسے بھلا دینے کے لئے دیکھا تھا لیکن کوشل نے اُسے ہمیشہ یاد رکھنے کے لئے دیکھا . . . . رجونتی نے آفتاب کے غروب ہوتے ہوتے اپنے تمام گاہکوں کو اس پار پہونچا دیا اور ساری کمائی بیمار باپ کے ہاتھ میں لا کر ڈال دی

کوشل بنارس ہندو یونیورسٹی کا ایم۔اے کا طالبعلم تھا، صحت کے لحاظ سے وہ ہمیشہ کمزور اور نازک رہا، محنت کی وجہ سے اس کی تندرستی خراب ہو گئی تھی۔ اور ڈاکٹروں نے ایک سال تک سلسلۂ تعلیم بالکل منقطع کر دینے کی رائے دی تھی، مکان پر رہ کر کوشل کی صحت درست ہونے لگی تھی۔ اب وہ روزانہ شام کو اُس طرف ٹہلنے جاتا جس طرف سے رجونتی کے آنے کی اُمید ہوتی، یوں تو کبھی کبھی لیکن دوشنبہ اور جمعہ کو اکثر رجونتی کشتی لے کر

رسول آباد آتی تھی، کوشل اُسے جس قدر بھی دیکھ سکتا تھا دیکھا کرتا، اُس کی خاموش محبت کوئلے کے نیچے دبی ہوئی چنگاری کی طرح اس کے سارے وجود پر چھائی جا رہی تھی اور وہ وقت قریب تھا جب محبت کے شعلے بھڑک کر کوشل کو جلا دیں

رجونتی جب بانسری بجاتی اور اپنے محبت سے بھرے ہوئے نغمے چھیڑتی تو وہ خود تصور میں کسی ایسی ہستی کو ڈھونڈھتی جس پر پریم سے بھرے ہوئے گیت صادق آئیں۔ جب وہ سرجو کے پسندیدہ گیت گاتی تو تنہائی میں بھی سرجو کی حریص نگاہیں اپنی آنکھوں سے ملتے ہوئے دیکھتی تھی، ادھر جب سے کوشل بار بار اُسے نظر آیا تھا اُسے یہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ اپنے تمام گیت اُسی کے حضور میں پیش کر رہی ہے

ایک روز رجونتی اپنی ذاتی ضرورت سے کشتی لے کر رسول آباد آئی، کوشل حسب معمول آج بھی منتظر تھا، محبت میں عزائم کی تیاری اور شکست، منصوبوں کا بندھنا اور ٹوٹ جانا، تاویلات کا قائم ہونا اور مٹ جانا معمولی باتیں ہیں، جب تک محبوب نگاہوں کے سامنے ہے۔ اُس وقت تک دل، دماغ اور آنکھیں سب محو نظارہ ہیں، لیکن وہ نگاہوں سے اوجھل ہوا اور دل و دماغ فکر میں مشغول ہوئے، کوشل نے کئی دفعہ ارادہ کیا کہ رجونتی کی کشتی میں بیٹھ کر تھوڑی دیر دریا کی تفریح کرے۔ لیکن اُسے کوئی قوت روکتی نظر آتی تھی، آج جبکہ بالکل سناٹا تھا کوشل ہمت کر کے ساحل آب کی طرف اضطراری طور پر بڑھا، قریب پہونچ کر ٹھہر گیا، جب تک رجونتی کشتی باندھتی رہی وہ اپنے جملے درست کرتا رہا جن کے ذریعہ سے وہ رجونتی سے مخاطب ہوگا، رجونتی کشتی باندھ کر کوشل سے ایک گز کے فاصلہ سے گذر گئی اور کوشل ایک بت کی طرح کھڑا رہ گیا، جب رجونتی بازار کی گلیوں کے پیچ و خم میں غائب ہوگئی اس وقت کوشل نے مڑ کر جانے والی کی طرف نگاہ کی

مایوسی کا انتظار تکلیف دہ ہوتا ہے اور امیدوں کا انتظار ایک شیریں خواب کی طرح پُر کیف، کوشل کو اطمینان سا تھا کہ رجونتی ابھی واپس آئے گی، اس لئے اس کے جذبات کی کوئی حد نہ تھی، وہ دریا میں اٹھتی ہوئی لہروں کو اپنے خیالات کے مد و جزر کے مقابلہ میں ہیچ سمجھ رہا تھا۔ . . . . دُور سے رجونتی آتی ہوئی نظر آئی اور کوشل کے تمام منتشر خیالات سمٹ کر صرف اس آرزو میں تبدیل ہوگئے کہ رجونتی کے ساتھ دریا کی سیر کرلے، وہ آئی اور کشتی میں بیٹھ گئی، ڈانڈ اٹھا کر چلنا ہی چاہتی تھی کہ کوشل کی تمنا اضطراری طور پر اُلجھے ہوئے الفاظ میں یوں نکل گئی۔ " میں بھی چلوں گا " بعض اوقات الفاظ احساسات عشق کے اظہار سے بالکل قاصر ہوتے ہیں محبت کی زبان ہی کچھ اور ہے اس کا راز گفتگو سے زیادہ خاموشی میں ظاہر ہوتا ہے پھر بھی رجونتی نے کوشل کا مقصد پالیا، اُس نے ڈانڈ ہاتھ سے رکھ دیا کشتی سے اُتر کر ساحل پر آگئی اور ایک طرف سر جھکا کر کھڑی ہوگئی کوشل بغیر کچھ کہے ہوئے کشتی میں سوار ہو گیا اس کے بعد رجونتی بھی آئی اور کشتی ایک طرف روانہ ہوئی،

ہوا مخالف چل رہی تھی اور کچھ عرصہ سے تند و تیز بھی ہو گئی تھی لہذا رجونتی کی زیادہ تر توجہ اُسی جانب تھی، اس کا چہرہ بار بار سرخ ہو جاتا تھا، ہوا اس کے بالوں کو منہ پہ لا کر منتشر کر دیتی تھی۔ اور اس کی ساری کا آنچل بار بار سر سے ڈھلک جاتا تھا۔ کوشل دیکھ رہا تھا اور مست ہو رہا تھا، وہ چاہتا تھا کہ رجونتی کو کسی طرح یقین آ جائے کہ وہ اس کی پرستش کرتا ہے اور پھر اس کے بعد کشتی دریا کی لہروں سے ٹکرا کر پاش پاش ہو جائے تاکہ پھر محبت میں ناکامی کی کوئی امید ہی باقی نہ رہے۔ اس نے آہستہ آہستہ گفتگو شروع کی، گذشتہ بارش کے متعلق اظہار خیالات ہوتا رہا، فصل اور زراعت کے متعلق بات چیت ہوتی رہی اور وہی کوشل جسے فلسفہ کی کاہش میں اور نفسیات کی کتابوں کے سوا کوئی بات ہی پسند نہ آتی تھی۔ آج رجونتی سے دیہات کی معمولی باتوں پر زیادہ جوش اور مسرت کے ساتھ محو گفتگو تھا، وہ اس وقت محبت میں گم ہو کر خود کو تمام خیالات سے بیگانہ بنائے ہوئے تھا، اپنے بھائی کے بچائے جانے پر اُسے اب تک اظہار شکر کا موقعہ نہ ملا تھا۔ اس نے جی کھول کر شکریہ ادا کیا، اظہار قبولیت میں رجونتی کی جھکی ہوئی آنکھیں اور زیادہ ہیجان پیدا کر رہی تھیں، اگرچہ کہنے کی ضرورت نہ تھی لیکن کوشل نے کہدیا کہ میں تجھ سے محبت کرتا ہوں صرف اس لئے نہیں کہ تو خوبصورت ہے بلکہ اس لئے کہ تو صحیح معنوں میں عورت ہے، رجونتی کے خیالات کے عمق کا پتہ کون لگا سکتا ہے لیکن اس کی قوت گھٹتی ہوئی۔ اور کشتی دریا کے چڑھاؤ پر رکتی ہوئی نظر آتی تھی، ایک طرف امواج آب میں تلاطم تھا دوسری طرف کوشل اور رجونتی کے پریم کی لہریں ضبط اور صبر کا باندھ توڑ کر باہر نکلی جا رہی تھیں، اظہار محبت کے لئے یہی ٹھیک وقت تھا کیونکہ ہر چیز محبت میں ڈوبی ہوئی نظر آ رہی تھی، ہر طرف محبت کی بارش ہو رہی تھی رجونتی نے یکایک کشتی رسول آباد کی طرف پھیر دی اور بہت تیز چلانے لگی۔ کوشل نے گھبرا کر پوچھا "کیا واپس چل رہی ہو؟" رجونتی نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے جواب دیا "ہاں" کشتی دھارے پر تیزی سے روانہ ہوئی اور وہ وقت جسے کوشل ختم ہوتا ہوا نہ دیکھنا چاہتا تھا اور تیزی سے کٹنے لگا، گھبراہٹ میں کوشل کچھ بات چیت بھی نہ کر سکا۔ رجونتی نے وعدہ کیا کہ وہ اکثر ملا کرے گی۔ کشتی کنارے پر آ گئی، کوشل اتر گیا اور جیب میں ہاتھ لے جا کر مزدوری نکالنی چاہی لیکن رجونتی کشتی لے کر کنارے سے دور جا چکی تھی، کوشل کے پکارنے پر اس نے صرف مڑ کر دیکھا اور بغیر کچھ کہے ہوئے کشن پور چلی گئی

اب کوشل اکثر رجونتی کے ساتھ سطح آب پر نظر آتا تھا دن گزرتے جاتے تھے اور دونوں میں محبت کے عہد و پیماں مستحکم ہوتے جاتے تھے۔ ...... رجونتی کی زندگی کا باب محبت قابل غور ہے، اُسے سرجو سے عشق تھا۔ اور کوشل سے محبت کرتی تھی، دونوں میں سے کسی ایک کو بھی وہ رنجیدہ دیکھنا نہ چاہتی تھی، اُسے یقین تھا کہ عنقریب اُس کی شادی سرجو سے ہو جائے گی۔ لیکن اس خیال نے کوشل کے التفات میں فرق نہ آنے دیا، وہ سرجو کو اپنا رفیق حیات سمجھتی تھی

اور کوشل کو محبت کئے جانے کے قابل جانتی تھی، لیکن اس نے کبھی یہ غور نہ کیا تھا کہ اگر سرجو اور کوشل ایک ہی وقت میں اس کے قریب ہوئے تو خود اس کی کیا حالت ہوگی یا اُن دونوں کے احساسات کا کیا عالم ہوگا۔ اس کے لئے اُسے زیادہ انتظار نہ کرنا پڑا اور ایک روز جب رجونتی سرجو کے ساتھ سئی ندی کے کنارے بہ نہایت محبت سے مچھلیوں وغیرہ کے متعلق گفتگو کر رہی تھی کوشل بھی آگیا۔ سرجو نے تو اُسی روز کہدیا "رجون، تمھاری بات میرے ساتھ ہو چکی ہے اب تم کسی اور سے اس طرح نہ ملو نہیں تو لوگ کیا کہیں گے" یہ سنکر رجونتی چونک پڑی۔ اور دوسرے روز جب کوشل نے اُسے تنہا پاکر سرجو سے نہ ملنے کے لئے کہا تو رجونتی کے دل پر چوٹ سی لگی، اُسے محبت کرنا تو آتا تھا لیکن محبت کی ان پیچیدگیوں سے ناواقف تھی کہ وہ ایک ہی وقت میں دونوں کو خوش نہیں رکھ سکتی، اس احساس نے اُسے تڑپا دیا لیکن مجبور تھی، دونوں کا دل رکھنے کے لئے اُس نے دونوں سے وعدہ کر لیا

سیتل کی بیماری نے طول پکڑا اُس نے شنکر کو بُلا بھیجا اور رجونتی کی شادی جلد کر دینے پر زور دیا، رجونتی کو سوا اس کے کہ کوشل کو اس خبر سے تکلیف ہوگی اور کوئی رنج نہ تھا، سرجو کے ساتھ شادی ہونا اس کی دیرینہ تمنا تھی، شادی ہو گئی اور رجونتی قریب قریب ایک مہینے تک رسول آباد نہ جا سکی، کوشل اس واقعہ سے بالکل بے خبر تھا اُسے معلوم تھا کہ رجونتی کی شادی سرجو ہی کے ساتھ ہوگی لیکن اس کے اس قدر جلد ہو جانے کا یقین نہ تھا۔ ایک مہینہ بعد رجونتی کشتی لے کر رسول آباد آئی کوشل سے ملاقات ہونے پر رجونتی نے نہایت معصومیت سے اس کا اقرار کر لیا کہ وہ اب سرجو کی ہو گئی ہے، لیکن کوشل کو یہ بھی یقین دلانے کی کوشش کی کہ اس کی محبت میں کوئی کمی نہیں۔ کوشل اسے اپنی محبت کی ناکامی سمجھ رہا تھا اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کے قطرے چمکنے لگے۔۔

...... یکایک اس نے رجونتی کا ہاتھ مضبوط پکڑ لیا اور اُسے گھور کر دیکھنے لگا رجونتی سہم گئی اور اُس نے مسترحم نگاہوں سے کوشل کو دیکھا، ہاتھ کی گرفت ڈھیلی ہو گئی اور آنسوؤں کے وہ قطرے جو اب تک پلکوں پر آکر تھرتھرا رہے تھے گر کر زمین میں جذب ہو گئے۔ ٹھیک اُسی وقت سرجو بھی آگیا اُس نے دونوں کو خوفناک نظروں سے دیکھا لیکن رجونتی کی حالت ہی کچھ عجیب تھی، جس طرح دو موٹر ایک ہی رفتار سے مخالف سمتوں میں گذر جائیں تو دونوں کے درمیان کی گرد اور سوکھی ہوئی پتیاں اپنی جگہ پر کانپ کر ساکت رہ جائیں گی اسی طرح رجونتی دونوں طرف کھنچ رہی تھی لیکن اُس کا سر نیچے سے اوپر نہ ہوتا تھا۔ سرجو نے بڑھکر اس کا بازو تھام لیا اور ندی کی طرف کھینچ لے گیا، کوشل اپنی جگہ پر ایک جسد بے روح کی طرح کھڑا رہ گیا، دور پہونچ کر رجونتی نے ایک دفعہ مڑکر اُسے دیکھا اور پھر ایک وفا شعار بیوی کی طرح سرجو کے قدموں میں گر کر رونے لگی

سیتل کا انتقال ہوگیا، باپ کی موت نے رجونتی پر بڑا اثر کیا وہ سُست رہنے لگی، سرجو اب خودکشی سے کر جاتا تھا اس نے رجونتی کو بہت کم تکلیف دی، دونوں کی ازدواجی زندگی نہایت پرمسرت تھی، اسی اثنا میں کوشل پر مرض کا سخت غلبہ ہوگیا، اس کی کمزوری بہت بڑھ گئی اور ڈاکٹروں کے مشورہ سے وہ کچھ دنوں کے لئے پہاڑ چلا گیا، جب سردی ناقابلِ برداشت ہوگئی تو وہ واپس آیا اور دو چار مہینے ادھر اُدھر رہ کر پھر منصوری چلا گیا، رسول آباد میں اس کا کوئی ایسا رازدار دوست نہ تھا جس سے رجونتی کے متعلق کچھ معلومات حاصل ہو اس لئے وہ ادھر سے بالکل بے خبر تھا لیکن یہ ضرور ہے کہ کبھی رجونتی کے خیال سے غافل نہیں رہا

کشن پور میں سخت طاعون پھیلا، موت کا شکار ہونے والی ہستیوں میں سب سے زیادہ عبرتناک سرجو کی ذات تھی، اس کی جوانی کی موت نے سارے گاؤں کو صدمہ پہونچایا، رجونتی پر سخت اثر ہوا، اس کا دماغ ماؤف ہوگیا اس نے گاؤں میں رہنا ترک کردیا اور دن رات سئی کے کنارے گذارنے لگی، وہ گیت جن سے کسی وقت سرجو پر وجد کی کیفیت طاری ہوجاتی تھی اور بعض اوقات وہ جوشِ محبت میں رجونتی کو سینے سے لگا لیا کرتا تھا۔۔۔۔۔ وہی گیت اب اس کے جنون کو کچھ دیر کے لئے پس پشت ڈال دیتی۔ اور وہ تصور میں سرجو کے گلے میں باہیں ڈال دیتی جب تھک جاتی تو آہستہ آہستہ کسی سے باتیں کرتی۔ یہی اس کا دن بھر کا مشغلہ تھا، سرجو کے چھوٹے بھائی بہن کبھی کبھی کھانے پینے کے لئے کچھ لاتے تھے۔ اور وہ دوسرے تیسرے دن کچھ کھالیتی تھی، جب لوگوں نے اُسے گھر میں آکر رہنے پر مجبور کیا تو ایک روز وہ کہیں غائب ہوگئی

کوشل تندرست ہوکر رسول آباد آیا اور سب سے پہلی فرصت میں کشن پور پہونچا۔ رجونتی کے متعلق تو کچھ دریافت نہ کرسکتا تھا لیکن اُس نے لوگوں سے سرجو کا حال دریافت کیا، اُسے مفصل کیفیت معلوم ہوئی، رجونتی کے پاگل ہوکر کہیں غائب ہوجانے کے خیال سے وہ کانپ اٹھا، محبت کی پہلی توہین بھول چکا تھا۔ اور وہ تمنائیں جو کوہستان کی محبت آمیز فضا میں اس کے سینہ میں پیدا ہوئی تھیں یک بیک مُردہ ہوگئیں اُسے خوب معلوم تھا کہ رجونتی سرجو کی ہے لیکن اُس چہرہ پر ایک نظر ڈال لینا ہی کافی تھا

گرمی بھی گذر گئی اور کوشل پھر بنارس واپس ہوا کہ اپنی تعلیم مکمل کرے۔ اُسے محبت کی دنیا میں سناٹا نظر آرہا تھا، اُس کی آنکھیں ہر وقت کسی کی جستجو میں سرگرداں رہتی تھیں، جس روز طبیعت زیادہ اُداس ہوتی تھی اُس دن وہ گنگا کے کنارے بیٹھ کر اپنا وقت اُن دنوں کی یادمیں کاٹ دیتا جن میں رجونتی اس کے احساسات محبت کو لطیف سے لطیف تر بنایا کرتی تھی، دریا خوب بڑھا ہوا تھا، کوشل کو اس کی موجوں کی طرح سکون نہ

تھا، وہ کنارے ہی کنارے پر دُور تک چلا گیا، واپس ہونا چاہتا تھا لیکن اس کے قدم آگے ہی کی طرف اُٹھ رہے تھے، ...... دُور سے اُسے بانسری کی آواز سُنائی دی، وہ دیوانوں کی طرح بڑھتا چلا گیا اور آواز اُس کے وجود کے ہر ذرّے میں سرایت کر گئی، اب وہ غلطی نہ کر سکتا تھا، یہ رجونتی کی آواز تھی اور اُسی کے گیت! کوشل درختوں اور جھاڑیوں کی آڑ سے نکل کر رجونتی کے پیچھے آگیا، رجونتی نے مڑ کر دیکھا اور پھر اپنے گیتوں میں منہمک ہوگئی، دو چار آدمی قریب کے کھیتوں میں کام کر رہے تھے لیکن کوئی بھی خاص طور پر رجونتی کی طرف مخاطب نہ تھا۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ عرصہ سے اس کو اسی حال میں دیکھ رہے ہیں۔ کوشل نے خوشی اور تعجب سے ملی ہوئی آواز میں "رجونتی" کو آواز دی رجونتی پر کوئی اثر نہ ہوا، کوشل بیٹھ گیا اور پوچھنے لگا "مجھ کو نہیں پہچانتی ہو رجونتی میں نے تجھ کو کہاں کہاں ڈھونڈھا" رجونتی نے کہا "پہچانتی کیوں نہیں" کوشل کی اُمیدیں بیدار ہونے لگیں اُس نے پوچھا "اچھا بتاؤ میرا نام کیا ہے؟"

"میں نہیں جانتی، نہیں، نہیں، میں نہیں جانتی" رجونتی نے چیخ کر کہا کوشل گھبرا گیا اور کہنے لگا "رجونتی کیا کوشل کو بھلا دیا؟" رجونتی بہت زور سے ہنسی اُس کے قہقہے میں دردناک ترنم تھا۔ اس نے کہا "کوشل! کوشل بھی مر گیا اور سرجو بھی—— دونوں—— ہاں کوشل بھی سرجو بھی—— کوشل اور سرجو"

"رجونتی مجھے پہچان میں کوشل ہوں!"

"نہیں نہیں جھوٹ ہے۔ کوشل اور سرجو دونوں وہ ہیں" اُس نے پانی کی طرف اشارہ کیا۔ اور فوراً دریا کی موجوں سے ہم آغوش ہوگئی، کوشل بھی فوراً ہی کود پڑا لیکن گنگا کی لہریں اُسے دُور بہا لے گئیں، لوگ دوڑے اور بڑی کوششوں سے دونوں کو نکالا رجونتی سرجو سے مل چکی تھی اور کوشل بیہوش تھا

کوشل اب بیمار اور شکستہ رہتا ہے اور گنگا کی پرستش صرف اس لئے کرتا ہے کہ رجونتی اُس کی گود میں ہے

احتشام (رضوی)

گلہائے جعفری

یعنی مرزا جعفر علی خاں اثر لکھنوی کے کلام کا انتخاب از نیاز فتحپوری۔ ابتدا میں جناب نیاز نے مختصراً لکھنوی شاعری پر تبصرہ بھی کیا ہے۔ ۵ر کے ٹکٹ بھیج کر حاصل کیجئے

مینیجر نگار لکھنؤ

انسان کی لازوال عظمت

"جب میں آکاش پر غور کرتا ہوں جو تیری قدرت کی کاریگری ہے، اور جب چاند اور ستاروں پر نظر ڈالتا ہوں جو تو نے منظم کئے ہیں، تو سوچتا ہوں کہ انسان کیا ہے جو تجھے اس کا خیال ہو، اور ابن آدم کیا ہے جو تو اس کو باریابی بخشے۔

تاہم تو نے اس کو اپنے سے دوسرے درجہ پر فائز کیا ہے، اور اس کو عزت و فضیلت سے سرفراز فرمایا ہے" (انجیل، حمد ۸ : ۳ : ۵)

قدیم عبرانی حمد کی یہ پاکیزہ شاعرانہ عبارت انسان کی بے بضاعتی اور نیز اُس کی عظمت کا خیال نہایت واضح الفاظ میں ظاہر کر رہی ہے۔ جب انسان رات کے وقت عالم بالا کی حیرت انگیز اور لامتناہی وسعت پر نظر ڈالتا ہے اور اس فضائے بسیط میں چاند اور ستاروں کو اس شان و شوکت کے ساتھ درخشاں دیکھتا ہے تو اس پر اپنی بے بضاعتی اور مناظر فطرت کے رعب و جلال کی ایسی کیفیت ...... طاری ہو جاتی ہے کہ بے ساختہ اپنے عجز و نیاز کا اس طرح اقرار کرتا ہے۔ "انسان جو ایک ذرۂ بے مقدار ہے اس کا تجھکو کیوں خیال ہو، اور تو کیوں ابن آدم کو باریابی بخشے" یہ اُس کا جذبۂ اولین ہے، لیکن اس کے بعد ہی کوئی چیز اس کو اپنی طرف کھینچتی ہے جس سے اس کی یہ ظاہری بے بضاعتی اور کم اگی ستاروں کی عظمت سے بھی زیادہ معلوم ہونے لگتی ہے اور وہ اس طرح اپنے خیال کا اظہار کرتا ہے "تاہم تو نے اُس کو اپنے سے دوسرے درجہ پر فائز کیا ہے، اور اس کو عزت و فضیلت سے سرفراز فرمایا ہے"

قدرت کی عظمت اور، بالخصوص عالم بالا کی غیر محدود وسعت اور شان و شوکت کے مقابلہ میں انسان کی بے بضاعتی کا خیال ہر زمانہ میں زبان زد خلایق رہا ہے اور آج بھی ہے۔ آج جبکہ فلکیات کے متعلق جدید انکشافات نے فضائے بسیط کی وسعت و عظمت میں غیر معمولی اضافہ کر دیا ہے جس کا عہد عتیق کے مفکرین تصور بھی نہیں کر سکتے تھے اسوقت سے انسان کی بے بضاعتی اور زیادہ متوثق ہو گئی ہے

جس وقت قدیم عبرانی مصنف نے آسمان کی طرف نظر اُٹھائی تو کیا دیکھا؟ ایک وسیع فضا جس کو وہ آسمان کہتا تھا، جو خیمہ کی طرح زمین پر چھایا ہوا تھا جس میں سورج، چاند اور ستارے کسی پُر اسرار طریقہ سے جڑے ہوئے تھے، جن کی

علت غائی صرف یہ تھی کہ وہ انسان کو موسموں کی تبدیلی کے نشانات بتلائیں اور زمین کو روشنی دیں، سب زمین کے چاروں طرف گھومتے تھے، اور زمین کے مقابلہ میں بہت ہی چھوٹے تھے اور عبرانی مفکر کے علم میں زمین کائنات کی سب سے بڑی چیز تھی اور وہ بھی اس کے تصور کے مطابق ہماری آج کی زمین کے مقابلہ میں بہت ہی محدود تھی

علم ہیئت کی جدید ترقی نے ان تمام خیالات میں ایک انقلاب پیدا کر دیا ہے۔ کیونکہ نہ تو وہ اجرام فلکی کا مرکز ہے اور نہ کائنات میں سب سے بڑی چیز ہے بلکہ برعکس اس کے جسامت کے اعتبار سے موجودات میں اس کی نسبتی حیثیت ایک ذرہ سے زیادہ نہیں۔ خاموش پُراسرار اور تغیر پذیر چاند ایک زرد آسمانی چراغ کے بجائے کرہ میں تبدیل ہو گیا، سورج زمین کے چاروں طرف گردش کرنے کی بجائے قائم ہو گیا اور زمین معہ دیگر سیاروں کے اُس کے گرد گھومنے لگی، ستارے مشعل شب کی بجائے عظیم الجثہ کرّوں میں منتقل ہو گئے جن کے گرد بڑی بڑی دنیائیں چکر لگا رہی ہیں۔ اگرچہ خود ہمارے نظام شمسی کی وسعت بھی کچھ کم نہیں ہے لیکن وہ بھی خلاء کے ایک قلیل ترین گوشہ میں واقع ہے جبکہ اُس کے گرد وپیش لاتعداد اور لامحدود نظام شمسی پھیلے ہوئے ہیں

پھر اگر دنیائے قدیم کے انسان کو اپنی اُس قلیل کائنات کے مقابلہ میں اپنی بے بضاعتی اور عجز کا اقرار تھا تو دُنیائے جدید کے انسان کے بارہ میں کیا کہا جا سکتا ہے جو جدید علم ہیئت کی ظاہر کردہ کائنات کے درمیان رہتا ہے اور جس کو قدیم عبرانی کائنات سے وہی نسبت ہے جو آفتاب کو ذرہ سے ہے

پھر جس طرح اس عہد میں انسان اپنی بے بضاعتی کا احساس کرتا تھا بالکل اسی طرح آج بھی وہ سوال کر سکتا ہے کہ کیا لامتناہی کائنات خالق اور ان تمام ستاروں اور کہکشاؤں کا تعمیر کنندہ انسان کی پرواہ کرتا ہے! کیا اس بات کے فرض کرنے کی کوئی معقول وجہ ہے کہ خدا کے نزدیک ہماری ننھی ننھی جانیں قطرۂ شبنم یا حباب دریا سے زیادہ وقیع، اہم اور مفید ہیں

میں سمجھتا ہوں کہ ہم میں سے ہر ایک کو اس قسم کا تجربہ ہوا ہوگا۔ آپ آدمیوں کی ایک بڑی جماعت کے درمیان سے گذرتے ہیں جن میں سے آپ نے نہ تو پہلے کسی کو دیکھا ہے اور نہ آئندہ دیکھنے کی توقع ہے۔ آپ اپنے سے سوال کرتے ہیں کہ یہ کون لوگ ہیں اور ان کی زندگی کا کیا مقصد ہے اور یہ کھیتوں پر اڑنے والے پرندوں کے گروہ سے یا دھوپ میں مجتمع ہونے والے جراثیم سے کس بات میں ممتاز ہیں؟ اگر کرۂ قمر سے جو دوسرے کرّوں کے مقابلہ میں دنیا سے سب سے زیادہ نزدیک ہے خواہ کتنی ہی طاقت کی دُوربین لگا کر باشندگان زمیں کو دیکھا جائے۔ تو کوئی بھی نظر نہیں آ سکتا اور یہ فاصلہ پرند، جراثیم اور انسان سب کو مساوی القامت بنا دیتا ہے

آپ کسی شہر میں ایک بلند مقام سے جہاں تک آپ کی نظر جائے اُن ہزارہا آدمیوں کو دیکھیے جو چاروں طرف پھر رہے ہیں تو وہ آپ کو فرش پر رینگنے والی چیونٹیوں سے زیادہ بڑے نظر نہ آئیں گے۔ اور وہ شہر آپ کو دیمک کا ٹیلہ معلوم

ہوگا۔ اسی طرح سے آپ دوسرے تمام شہروں، قصبوں، اور دیہات کو قیاس کر سکتے ہیں کہ ان میں مختلف الاقسام چیونٹیاں آباد ہیں جو کسی دوسرے کرہ سے نہیں بلکہ اسی کرہ پر صرف چند میل کے فاصلہ سے ناقابلِ امتیاز ہیں

نسل انسانی کو اپنے ان کارناموں پر بہت بڑا فخر ہے جو اس نے اس دنیا میں کئے ہیں۔ اس کو اپنی زراعت پر، تجارت پر، بر اعظموں کا احاطہ کرنے والی ریلوں پر، سمندروں کو عبور کرنے والے عظیم الشان جہازوں پر، سر بفلک کشیدہ عمارتوں والے شہروں پر، چشم زدن میں گردِ زمین خبریں پہونچانے والے لاسلکی پیغامبروں پر اور بلند پرواز طیاروں پر ناز ہے۔ لیکن اگر مریخ اور زہرہ پر آبادی ہے تو وہاں کے کسی باشندہ کو ان تمام باتوں میں سے ایک بات کا بھی علم نہیں۔ پس اس طرح سے ہماری دنیا کے اہم ترین واقعات صرف ہم ہی تک محدود معلوم ہوتے ہیں اور فضائے بسیط میں ہمارے قریب ترین ہمسایوں کو اُن کی پرچھائیں بھی نظر نہیں آتی

پھر اگر ہم ایک ہی نظام کے دیگر اراکین سے اسقدر بے تعلق ہیں کہ جو کچھ ہم کرتے ہیں وہ نہ تو ان کو معلوم ہوتا ہے اور نہ اُن کے واسطے کوئی اہمیت رکھتا ہے، تو ان تمام دیگر نظاموں کے بارہ میں کیا کہا جا سکتا ہے جو ہمارے مختصر نظامِ شمسی کے حدود سے باہر یا غیر محدود فاصلوں پر واقع ہیں اور شب تار میں اقصائے عالم کو منور کر دیتے ہیں، اور پھر اس بے نیاز ہستی کے متعلق کیا خیال کیا جا سکتا ہے جو ان سب کا خالق اور حاکم ہے؟ ایسے ایسے اہم اور غیر مختتم انتظام کی موجودگی میں اس خالق اکبر کو انسان جیسی بے ثبات مخلوق کا کیا خیال ہو سکتا ہے جو اس خاکریزہ پر آباد ہے جس کو دنیا کہتے ہیں اور جو آفرینش کے ایک دُور افتادہ اور حقیر گوشہ میں ایک دھندلے نشان سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی؟ کیا یہ فرض کر لینا حقیقت میں ایک نامناسب خودستائی نہ ہوگی کہ ہم اُس کی توجہ کو اپنی طرف منعطف کرنے کی توقع کر سکتے ہیں! علاوہ بریں کیا ایک ہم جیسی بے وقعت مخلوق کے لئے موت کے بعد ایک حیات ابدی کا خواب دیکھنا ایک بہت بڑا گستاخانہ قیاس نہ ہوگا،

اسی طرح سے علم ہیئت کے جدید انکشافات بہت سے دماغوں پر انسان کی ذلت و حقارت کا نقش جما دیتے ہیں اور اس سے قبل انسان کائنات میں جو کچھ اپنی وقعت اور اہمیت سمجھتا تھا اس کا استیصال کرکے اس کی بے بضاعتی اور مایوسی میں اضافہ کر دیتے ہیں۔ لیکن اس کا ہمارے پاس کیا جواب ہے

یہ مسئلہ محض قیاسی نہیں ہے بلکہ بہمہ وجوہ عملی ہے۔ دنیا میں اس قسم کے سوالات آج ہزاروں جگہ پوچھے جاتے ہیں اور ہمارے چاروں طرف پوچھے جا رہے ہیں اور بہت سے ذی فہم اور سنجیدہ لوگ ان کا جواب دینے سے قاصر ہیں جس کا نتیجہ یہ ہے کہ بہت سی زندگیاں حقیقتاً تاریک ہو جاتی ہیں۔ اور کیا در حقیقت خود ہم میں سے بعض لوگوں پر ایسے لمحے نہ گذرے ہوں گے۔ جب اس قسم کے خیالات ان پر مسلط ہوئے ہوں۔ اس لئے ہمیں اس تاریک پردہ کو اٹھا کر حقیقت کے چہرے کو بے نقاب کرنے کی کوشش کرنا چاہیے۔

اس مسئلہ پر کئی پہلوؤں سے روشنی ڈالی جاسکتی ہے۔ اوّل یہ کہ کسی چیز کی اہمیت کا دارومدار محض جسامت پر نہیں ہوتا۔ ہماری دنیا کسی دوسری لاکھوں گنی بڑی دنیا سے لازمی طور پر اہمیت میں کسی طرح کم خیال نہیں کی جاسکتی اور انسان بھی محض اپنی جسمانی قلت کے باعث مادی حیثیت سے بھی لازمی طور پر غیر اہم تصور نہیں کیا جاسکتا۔ ہاتھی انسان سے بہ لحاظ جسامت کے بہت بڑا ہے لیکن اس کی جسمانی حیثیت اس کی اہمیت اور وقعت کو نہیں بڑھاتی دنیا کے بہت سے چھوٹے چھوٹے ممالک اپنے سے سیکڑوں گُنا بڑے ملکوں سے اہمیت اور وقعت میں کہیں زیادہ ہیں ہزار ہا ریگستانوں کے مقابلہ میں یونان کا چھوٹا سا ملک زیادہ وقیع ہے۔ اور لندن جو روئے زمین پر ایک خال کی مانند ہے قطبین کے ایک درجن بڑاعظموں سے افضل ہے۔ ایک تنہا افلاطون، یا شکسپیر، یا یسوع، یا بودھ دنیا کی تاریخ میں افریقہ کی تمام وحشی نسلوں سے اسی طرح زیادہ قابل قدر ہے جس طرح ایک ہیرے کا ٹکڑا ایک کوہ پیکر تودۂ خاک سے زیادہ قیمتی ہے۔ اسی طرح مختلف دنیاؤں کا موازنہ کرنے میں یہ بات بعید از قیاس نہیں ہے کہ چھوٹی دنیا بڑی دنیا سے بدرجہا زیادہ ترقی یافتہ ہو۔ ہمارا سورج باعتبار مادیت زمین سے تین لاکھ سولہ ہزار گناہ زیادہ ہے اور بلحاظ جسامت کے بارہ لاکھ بچاس ہزار گنا بڑا ہے تاہم زمین پر اعلےٰ قسم کی زندگی پائی جاتی ہے جبکہ سورج میں غالباً کسی قسم کی حیات موجود نہیں ہے اور گمان غالب ہے کہ فضائے بسیط میں جس قدر بڑے ثوابت ہیں۔ وہ تمام طور پر اپنے سیاروں سے بہت کم ترقی یافتہ ہیں

اس سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ نسل انسانی محض ایک ناچیز کرہ پر آباد ہونے کے باعث لازمی طور پر ناچیز اور غیر اہم نہیں ہے۔ کیونکہ ایک ایتھنز جیسے چھوٹے مقام پر رہنے والا انسان محض اس وجہ سے حقیر نہیں سمجھا جاسکتا کہ وہ تاتار جیسے وسیع ملک میں رہنے کی بجائے ایتھنز جیسی چھوٹی جگہ میں رہتا ہے۔ اعلیٰ فطرت والی ممتاز ہستیاں چھ فٹ کے جسم میں بھی اس خوبصورت چھوٹی سی دُنیا پر اسی احسن پیرایہ میں بسر کرسکتی ہیں جس طرح کہ چھ ہزار فٹ کے جسم میں کائنات کے بڑے سے بڑے کرہ پر کرسکتی ہیں

بہر نوع اگر ایک طرف یہ بات مسلم ہے کہ علم ہیئت کی موجودہ تحقیقات انسان کو ایک مورِ ضعیف ثابت کر رہی ہے تو دوسری طرف اس بات کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا کہ طبیعیات کے دیگر اکتشافات کا فیصلہ بالکل اس کے برعکس ہے۔ سطح انسانی سے نیچے ایک اور مکمل اور منظم کائنات معرض ظہور میں آرہی ہے۔ جو کائنات بالائی سے کسیطرح کم حیرت انگیز نہیں ہے، اسلئے اگر ایک علمی تحقیقات نے انسان کا رتبہ کم کر دیا ہے تو دوسری علمی تحقیقات نے اسکو اسی قدر بلکہ اس سے بھی زیادہ کر دیا ہے۔ پس اسطرح سے دُوربین نے انسان کی قدر و منزلت میں جو کچھ کمی پیدا کر دی تھی خوردبین نے اسکا ازالہ کر دیا ہے

تحت الانسان کائنات کی ترتیب و عظمت کے متعلق بعض حقایق کا انکشاف دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ اگر موسم گرما میں ایک تیتری کو پکڑ لیں تو اُس کے پروں سے ایسے ذرات چھوٹ کر ہمارے ہاتھ پر لگے رہ جائیں گے

جن کو ہم معمولی خاکریزوں سے تعبیر کریں گے اور چشم عریاں سے نہایت غور کے ساتھ مشاہدہ کرنے کے بعد بھی ہم ان کو خاکی ذرات سے تمیز نہ کرسکیں گے۔ لیکن اگر ہم ایک خوردبین سے اُن کا معائنہ کریں تو عجیب وغریب مناظر دکھائی دیں گے اب ہم کو یہ معلوم ہوگا کہ وہی خاکریزے مختلف الالوان و اوضاع پروں سے ایسے مکمل نظام کے ساتھ منظم ہیں جیسے کسی پرندکے پر ہوتے ہیں اور اس قدر چھوٹے.... کہ ایک مربع انچ میں ایک لاکھ آسکتے ہیں

ایک قطرہ آب کی کیا بضاعت ہے لیکن یہی قطرۂ آب ایک جداگانہ دنیا ہے۔ ایک مکعب انچ آب ساکن میں قریب دس ارب کے متحرک اور زندہ مخلوق پائی جاتی ہے۔ نیویارک کے ایک ممتاز ماہر علم الحیات کا بیان ہے کہ "میں نے تھوڑا سا ارنڈی کا صاف اور جوشیدہ پانی ایک شفاف شیشی میں بھر کر کپڑے کے برش کے چند بال توڑ کر اس میں ڈال دیے، چار روز کے بعد شیشی بے شمار اور ناقابل تجزیہ زندہ مخلوق سے بھر گئی اور بلاخوف تردید یہ دعوے کیا جاسکتا ہے کہ دو آونس کی شیشی میں اُن کا شمار اُن تمام انسانوں کی مجموعی تعداد سے زیادہ تھا جو زمانۂ آدم سے اس وقت تک پیدا ہو چکے ہیں "

اہرنبرگ ایک مشہور جرمن ماہر حیاتیات، کا قول ہے کہ بوہیمیا میں آٹھ فٹ کی گہرائی تک چالیس مربع میل میں سلیٹ کا ذخیرہ موجود ہے جس کے ہر ایک مکعب فٹ میں خوردبینی پیمائش کے ذریعہ سے اکتالیس ارب کا پسماندہ دریافت کیا گیا ہے۔ جہاں چشم عُریاں کو حیات کے آثار تک نظر نہیں آتے وہاں خوردبین کے ذریعہ سے نئی نئی دنیائیں آباد معلوم ہوتی ہیں۔ جہاں کل تک ایک ذی حیات بھی موجود نہ مانا جاتا تھا وہاں آج جدید سائنس نے ایسے حیرت انگیز عالم حیات پیش نظر کر دیے جیسے دُوربین کے ذریعہ سے فضائے بسیط میں نظر آتے ہیں، اور جن میں انسان سے اسی قدر چھوٹی مخلوق آباد ہے جس قدر انسان ان اجرام فلکی سے چھوٹا ہے

درخت ایک کائنات ہے اور برگ درخت اس کی ایک دنیا ہے۔ آپ کی عریاں اور غیر مانوس آنکھ کچھ نہیں دیکھ سکتی، لیکن اگر آپ ایک خردبین لیکر کسی ماہر طبیعیات کو اپنا رہبر بنائیں تو وہ آپ کی آنکھوں سے حجاب اٹھاکر ایسے ایسے عجیب وغریب رازہائے سربستہ کو بے نقاب کردے گا کہ آپ کو اپنے گردوپیش کھلے ہوئے دروازے نظر آئیں گے۔ جن میں داخل ہوکر آپ قدم قدم پر ایسی ہی لاانتہا اور تعجب خیز چھوٹی چھوٹی دنیائیں مشاہدہ کریں گے جیسی کہ دوربین کے ذریعہ سے فضائے بسیط میں نظر آتی ہیں

خود انسان کا جسم بھی ایک کائنات ہے۔ انسانی خون کے ہر قطرہ میں دو کروڑ سے زیادہ جراثیم حیات پائی جاتی ہیں۔ اس طرح سے تمام قطرہائے خون ملاکر انسان ایک کائنات ہے اور اس کی شرائیں کہکشاں ہیں جن کے حلقوں میں ان سیارہائے احمر کے گروہ اپنے غیر مختتم دور لگا رہے ہیں

الغرض اگر ہم انسان کی روحانی حیثیت سے بھی کوئی سروکار نہ رکھیں اور اس کو محض ایک کرم ماہی ہی تصور

کریں تب بھی وہ خدا کی مخلوق میں درجۂ متوسط کا مستحق ہے۔ اگر بالائے انسان اُس سے بدرجہا بڑے عالم، نظام اور کہکشاں موجود ہیں تو زیریں انسان اور اندرونی انسان میں بھی اس سے بدرجہا چھوٹے عالم، نظام اور کہکشاں موجود ہیں اگر ایک طرف فضائے بسیط کی بے پایانی اس کی وقعت کو گھٹاتی ہے تو دوسری طرف برگ درخت، قطرۂ خون اور خود اس کے مادۂ ترکیبی کی لاانتہائی اس کی منزلت کو بڑھاتی ہے۔ اس لئے اگر کوئی جسامت کی بناپر ہماری تحقیر کرے اور انجم زار آسمان کی طرف اشارہ کرکے یوں طعنہ زن ہو کہ کیا آپ کا یہ اعتقاد ہے کہ ان بعید از شمار دنیاؤں کا خدا آپ کی پرواہ کرتا ہے تو ہم اس کو ایک قطرۂ آب کے کروروں کیڑوں کی طرف اشارہ کرکے یہ جواب دے سکتے ہیں کہ وہ خدا جو ان کو فراموش نہیں کرتا ہم کو کیونکر فراموش کر سکتا ہے۔

یہاں یہ بات بھی نظر انداز نہیں کی جاسکتی کہ انسان کی حقیقی عظمت مادی لحاظ سے نہیں ہے بلکہ روحانی اعتبار سے ہے۔ انسان کی جو کچھ وقعت ہے۔ وہ اس کے دماغ کی وجہ سے ہے نہ کہ جسم کی وجہ سے، اس لئے اگر اس کے رہنے کی دنیا چھوٹی ہے تو کیا اور بڑی ہے تو کیا۔ کیا ایک مادی عرض وطول سے محدود گوہ تمثال تودۂ خاک ایک عرض وطول سے مبرّا اور مادی حدود سے منزہ نفس کا مقابلہ کر سکتا ہے؟ کیا مادہ کے ایک سربفلک کشیدہ ڈھیر کے مقابلہ میں روح مجوب وسرنگوں ہو سکتی ہے؟ کیا ایک پہاڑ کو خیال سے بڑا کہہ سکتے ہیں؟ کیا ایک بڑے سے بڑا سمندر مادہ انسانی دماغ پر تفوق حاصل کر سکتا ہے جو اس کو اپنے تصور میں محصور کر لیتا ہے، اس کو شاہروں میں منتقل کر دیتا ہے، اس کے ایک کنارہ سے دوسرے کنارہ پر اس طرح پر گفتگو کر سکتا ہے گویا کہ اس کے ہزارہا میل محض چند انچوں کے برابر ہیں، اور اس کی خوفناک ترین لہروں کو اپنا غلام بنا لیتا ہے؟ اور کیا وہ تمام دوربین سے ظاہر کی ہوئی غیر شعوری دنیائیں ایک شعوری دماغ کے مقابلہ میں کوئی حیثیت رکھ سکتی ہیں؟

فلکیات جدیدہ کے انکشافات اجرام فلکی کے درمیان اس دنیا کی قدیم اہمیت کو خواہ کتنا ہی گھٹادیں لیکن وہ اس وقت تک انسان کی عظمت کو کوئی ٹھیس نہیں لگا سکتے جب تک اُس میں قوتِ شعور موجود ہے۔ انسان کی عظمت اس کی فطرت میں ودیعت کی ہوئی طاقت کی بدولت ہے۔ اس لئے وہ سائنس کی تمام امکانی مادی تحقیقاتوں سے غیر متاثر ہے وہ محض اس لئے بڑا ہے کہ وہ جان سکتا ہے، استنباط کر سکتا ہے، حق و باطل میں تمیز کر سکتا ہے، امید کر سکتا ہے محبت کر سکتا ہے عبادت کر سکتا ہے اور یہ چیزیں وہ اس لئے کر سکتا ہے کہ وہ روح ہے۔ لیکن دُوربین کی ظاہر کی ہوئی بڑی سے بڑی دنیا محض ایک تودۂ مادّی ہونے کے باعث ان میں سے ایک کام بھی کرنے سے ایسی ہی معذور ہے جیسے کہ ایک ہوا میں اُڑنے والا حقیر کیڑا یا خاک ریزہ معذور ہے اور اسی سے انسان کی اُس لامحدود اور لازوال فضیلت کا اندازہ ہو سکتا ہے جو اس کو فضائے بسیط میں عظمت وشان سے چمکنے والے تمام لاتعداد اور عظیم الجثہ کروں پر حاصل ہے

یہ بات بھی قابل غور ہے کہ انسان کا فضائے بسیط میں منتشر ستاروں کو دیکھ کر حیرت زدہ ہو جانا اس کی حقارت کی

علامت نہیں ہے بلکہ بزرگی کا نشان ہے - ایک سنگریزہ یا ایک مٹی کا ڈھیلا کیا حیرت زدہ ہو سکتا ہے۔ محفل ثوابت و بزم سیارگاں کو دیکھ کر ایک وحشی درندہ میں کوئی حِس تک پیدا نہ ہوگی - وحشی درندہ اس لئے بے حِس ہے کہ اس میں قوتِ شعور نہیں ہے اور انسان اس لئے حمد و ثنا کرتا ہے کہ وہ جانتا ہے، سمجھتا ہے، محسوس کرتا ہے، اور اس کی لطیف روح عالم قدس کے ساتھ التزام رکھتی ہے۔ دنیا کا تصور دنیا سے بہتر ہے اور ستاروں کا علم ستاروں سے برتر

سورج جسامت میں بہت بڑا ہے اور اُس کی جسامت کے مقابلہ میں زمین بالکل بے حقیقت شے ہے، لیکن اس سے انسان کی حقیقی عظمت پر کوئی اثر نہیں پڑ سکتا - کیا سورج باوجود اس قد و قامت کے خود اپنی پیمائش کر سکتا ہے اپنا وزن جان سکتا ہے، فضائے لبسیط میں اپنے دائرۃ البروج کا اندازہ کر سکتا ہے یا اُن قوانین قدرت میں سے جن کی وہ کورانہ پابندی کر رہا ہے ایک قانون کو بھی سمجھ سکتا ہے، لیکن انسان یہ سب کچھ کر سکتا ہے اور اس لئے وہ باوجود قد و قامت میں چھ فٹ ہونے کے سورج سے بڑا ہے

علم ہیئت ہم کو ستاروں کا بہت کچھ حال بتاتا ہے لیکن کیا ہم کبھی یہ توقع کر سکتے ہیں کہ وہ ہم کو اسی قدر انسان کا حال بھی بتلا سکتا ہے - انسان کا دماغ یہی نہیں کہ علم الافلاک کی روز افزوں ترقی کا ساتھ دینے کی قابلیت رکھتا ہے بلکہ وہ اس کی ترقی کا سبب ہے - اگر سموات خداوند تعالےٰ کی قدرت کے مظاہرات ہیں تو وہ اسی قدر انسانی روح کی عظمت کے بھی نشانات ہیں کیونکہ انسان محض اپنی روحانی فضیلت ہی کے باعث کائنات کے ذرہ ذرہ میں قدرت کے جلوؤں کا مطالعہ کرتا ہے

کائنات کی تخلیقی طاقتیں خیال اور محبت ہیں اور چونکہ انسان ان دونوں صفات سے متصف ہے اس لئے وہ خالق ہے

جینگ کا قول ہے کہ تمام نفس ایک ہی سلسلہ سے ملحق ہیں - اگر یہ حقیقت ہے تو میرا وجود بھی وجود حقیقی سے متصل ہے - اس قادر مطلق نے میری ہستی کو محض پیدا ہی نہیں کیا ہے بلکہ میرا اس کے ساتھ رشتۂ قرابت ہے کیونکہ میری روح روحِ حقیقی سے مشتق ہے - میں بھی اسی طرح جانتا ہوں جس طرح سے وہ جانتا ہے اور اسی طرح سے محبت کرتا ہوں جس طرح سے وہ محبت کرتا ہے، اس لئے مجھے جس طرح اُس "نور السموات والارض" کے مشاہدۂ جمال کا حق حاصل ہے - اسی طرح یہ کہنے کا بھی حق حاصل ہے کہ تو میرا حقیقی باپ ہے اور میں کوئی تیری از دست افتادہ چیز نہیں ہوں بلکہ تیرا بچہ ہوں اور تیری برگزیدہ فطرت مجھ میں موجود ہے

انسانی عظمت کے مستحکم ترین ثبوتوں میں سے ایک ثبوت قطعی اور نئے ذریعہ سے حاصل ہوا ہے اور وہ ذریعہ "جدید نظریۂ ارتقاء" ہے - اس سے قبل انسان کا خیال بالکل مختلف تھا اور "ارتقاء" ایک خوفناک شے معلوم ہوتا تھا کیونکہ وہ انسان کی پیدائش کو عمل فطرت سے منسلک کرتا تھا اور اس کی موجودہ نمو یافتہ ہیئت کذائی

کو ادنیٰ قسم کی حیات سے مستلزم کرتا تھا اور اس لئے وہ تذلیل انسانیت کا باعث سمجھا جاتا تھا، لیکن اب یہ سب باتیں بدل گئی ہیں اور بڑے بڑے ارباب فکر اس حقیقت کو تسلیم کرتے جاتے ہیں کہ نظریۂ ارتقا نے انسان کی عظمت میں غیر محدود اضافہ کر دیا ہے ۔ چونکہ انسان لاریب تمام سابقہ مدارج ارتقا کی حد کمال ہے اس لئے وہ اس تمام عمل فطرت کی معقول ترین اور مناسب ترین توجیہہ پیش کرتا ہے ۔ عمل ارتقا اپنی آتشی حالت کی ابتدا سے دور دراز راستے طے کر کے اس منزل پر پہونچا ہے جو آج ہماری پیش نظر ہے لیکن اس نے ہمیشہ آگے ہی کو قدم بڑھایا ہے جس کی معراج انسان ہے ۔ غیر ذی حیات سے ذی حیات تک، ادنیٰ قسم کی حیات سے اعلیٰ قسم کی حیات تک اور حیوان سے انسان تک سلسلہ بسلسلہ گامزن ہوا ہے اور اس طرح انسان آفرینش کی بلند ترین منزل پر پہونچ گیا ہے جو آفرینش کا نصب العین اور منزلِ مقصود ہے ۔ جس وقت مادی جسم اپنی امکانی حد تک پہونچ گیا اس وقت نفس کی ابتدا ہوئی جس نے اسی وقت سے حکمرانی شروع کر دی اور مُدرک انسان کو وہ شرف حاصل ہوا جو صرف مدرک مطلق کی عظمت سے دوسرے درجہ پر ہے

ہمیں اس بات کا علم نہیں ہے کہ کائنات کی دوسری کتنی دنیاؤں میں عمل ارتقا ترقی کی اس منزل پر پہونچ گیا ہے جس پر کہ وہ ہمارے یہاں پہونچا ہے ۔ لیکن اگر کسی جگہ ایسا ہوا ہے تو وہاں بھی اُس نے کسی نہ کسی شکل میں انسان ہی کا روحانی مثنیٰ پیش کیا ہوگا یعنی کوئی اس قسم کی ہستی پیدا کی ہوگی جس میں انسان کی طرح ایسی قوت ادراک و شعور پائی جاتی ہو جو " الٰہی خیالات کو اسی کی طرح خیال کر سکے " جیسا کہ انسان کر سکتا ہے، جو اس جہان میں " عمل ارتقا " کا ویسا ہی شاندار تکملہ ہو جیسا اس جہان میں انسان ہے اور جو بدیں سبب کسی صحیح مفہوم میں وہاں پر خدا کا ایسا ہی ہمشکل اور ہم رشتہ ہو جیسا انسان یہاں پر ہے

اس بنا پر یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ مادۂ اولین کی پہلی حرکت سے لیکر اس وقت تک کائنات کا تمام " عمل ارتقا " اس دنیا میں اور نہ معلوم کتنی اور دنیاؤں میں اسی اُدھیڑ بن میں مصروف رہا کہ انسان یا اُس کا مماثل پیدا کرے پھر اگر کائنات اس تمام " عمل ارتقا " کے مصائب و مصارف برداشت کرنے کے بعد ایسی اعلیٰ فطرت کا انسان بنانے میں کامیاب ہوئی ہے تو کیا اس کا انجام بھی اسی مناسبت سے اعلیٰ اور افضل نہ ہونا چاہئے اور کیا اس کی حیات بعد الممات عارضی مکان و زماں کی قیود سے آزاد نہ ہونی چاہئے ؟ کیا ان تمام موجودات کا خالق اکبر اور صانع حقیقی ایسا غیر معقول ہے کہ وہ اپنی کامل ترین مخلوق کو پایۂ تکمیل تک پہونچاتے ہی نیست و نابود کر دے گا ؟ اگر انسان الٰہی الاصل ہے اور اعلیٰ الٰہی صفات سے مشرف ہوا ہے تو کیا وہ فنا ہو سکتا ہے اور کیا اس کو ایک ایسی ہی بقا کا وارث نہ ہونا چاہئے جو بقائے الٰہی کے متوازی ہو ؟

لوگ دوسری دُنیاؤں، نظامہائے اور ہجوم سیارگاں کو انسان کی تذلیل و تحقیر کے لئے بطور دلیل کے پیش

کرتے ہیں، لیکن کیا یہ ممکن ہے کہ ادنیٰ اعلیٰ پر سبقت لے جائے؟ کیا کوئی مادی شے، خواہ وہ جسامت میں کتنی ہی بڑی کیوں نہ ہو، روح پر فایق یا نفس پر غالب ہو سکتی ہے؟

کائنات خدا کا ایک نادر محل ہے۔ لیکن کیا محل اولاد سے زیادہ قیمتی ہے؟ کیا کوئی باپ ایسا ہے جس کے پاس ایک ایسا محل ہو جس کی وسعت شمال سے جنوب تک ہو، جس کی چھت کہکشانی نقش و نگار سے منقش ہو اور جس میں لاکھوں آفتاب جگمگا رہے ہوں، اور بے ساختہ نہ پکار اٹھے کہ مجکو اپنا بچہ ان تمام چیزوں سے زیادہ عزیز ہے؟

اس لئے جب میں تمنارات کے وقت آسمان کے نیچے چلتا ہوں اور اس چرخ نیلوفری کے محیر العقول اور غیر محدود نقش و نگار کو دیکھتا ہوں تو میں عرش دوام سے یہ آواز آتی ہوئی سنتا ہوں کہ اے وہ انسان جس کو میں نے اپنی ہی شکل پر بنایا ہے۔ تو میری نظروں میں تمام موجودات سے زیادہ عزیز ہو سورج اور ستاروں کی پیدائش سے بھی قبل میں تجھ سے محبت کرتا تھا، جبکہ تو دور افتادہ مقامات پر آتشی کروں کے گہوارہ میں کھیلتا تھا۔ میں اس وقت بھی تیرا نگراں تھا، تیرا اور میرا انجام ایک ہے، کبھی تجکو کوئی چیز مجھ سے جدا نہیں کر سکتی۔ اور جب عالم بالا کی آواز خاموش ہو جاتی ہے تو میں ویسی ہی ایک اور صدائے لاہوتی اپنی روح کے تخنگاہ وجدانی سے آتی ہوئی سنتا ہوں۔ کہ اے میری زندگی کے مالک خدا میں تجھ پر بھروسہ کرتا ہوں اور میں جس وقت تیرے اس نگارخانۂ قدرت کے خوبصورت دنیوی محل میں داخل ہوا تو تیرے ہی پاس سے آیا، یہاں تو نے مجکو صرف چند سال قیام کی اجازت دی ہے تاکہ میں تیرے ساتھ رہ کر اور تیری امداد سے قدرت کی ان صنعتوں اور نیز اپنی رُوح .... کے عجائبات کا مطالعہ کروں، تجربات زندگی حاصل کروں، حتے الوسع اپنے ہم جنسوں کی مدد کروں اور اپنے دیگر فرایض منصبی کو انجام دوں۔ میں ایسی زمین پر عارضی قیام کے واسطے تیرا شکرگزار ہوں۔ میں بہت جلد یہاں سے کسی نامعلوم مقام کو روانہ ہو جاؤں گا جس کا تجکو علم ہے۔ مگر میرے لئے یہی امر باعث تسکین ہے کہ میں جہاں کہیں رہوں گا تیرے ہی ساتھ رہوں گا۔ موت صرف تیرے غیر محدود مکان کے دوسرے دروازے کھول دے گی۔ اس لئے مجکو کوئی ہراس نہیں جہاں تو ہے وہ جگہ خوبصورت ہے حتے کہ دوزخ بھی تیرے ساتھ۔ میرے لئے بہت محفوظ مقام ہے

(جے۔ ای سنڈر لینڈ) عبد الحفیظ (علیگ)، میرٹھ

دو ادبی شاہکار

شوپنہار۔ فلسفۂ شوپنہار پر ایک بے مثل تبصرہ عہ (علاوہ محصول)

مثنوی زہر عشق۔ مجلد معہ رنگین تصاویر و تین مقدمات قیمت عہ (علاوہ محصول)

منیجر نگار لکھنؤ

مکتوبات نیاز

آرام جاں

کل میاں نثار کا خط ملا اور اس صحبت کا حال معلوم ہوا جو وہاں برپا ہوئی تھی۔ جلیل صاحب نے جو کچھ فرمایا وہ اصولاً صحیح ہو یا نہ ہو، لیکن چونکہ حسب حال ہے اس لئے بہت پسند آیا، میاں ذاکر نے جن الفاظ میں میرا ذکر کیا، ان پر مجھے فخر ہو یا نہ ہو، لیکن رسم تشکر ادا کرنے کو ضرور جی چاہتا ہے۔ تم لاکھ کہو کہ مجھے علم نہیں میرا کوئی اشارہ شامل نہیں، لیکن میں تو جانتا ہوں کہ

کارِ زلفِ تست مشک افشانی اما عاشقاں
مصلحت را تہمتے بر آہوئے چیں بستہ اند

بہر حال یہ حقیقت نہ ہو۔ تو بھی مصلحتاً یا رعایتاً سر جھکا لو۔ اور مجھ سے یہ پندار نہ چھینو کہ دنیا میں جو کوئی مجھے اچھے نام سے پکارتا ہے، وہ حقیقتاً تمھاری ہی آواز ہے

خاں صاحب

حیران ہوں کہ آپ کی وضع عاشقانہ کی داد دوں، یا آپ کے اخلاق کریمانہ کی، یعنی میری سمجھ میں نہیں آتا کہ جو کچھ آپ نے ارشاد فرمایا وہ صرف بربنائے محبت تھا جو میرے لئے مخصوص ہے یا یہ کہ اس نوع کا لطف فرمانا آپ کی فطرت ہے، تعیین و تخصیص سے بے نیاز!

خونی مجرم کو بھی ایک بار اظہارِ حال کا موقعہ دیا جاتا ہے نہ کہ میں جس کا جرم اس سے زیادہ نہیں کہ رات کو دن نہیں کہتا اور دن کو دن سمجھتا ہوں۔ بہر حال مجھے مسرت ہوئی کہ آپ نے میری طرف سے اپنی بیزاریوں کا اعلان کرکے برسوں کی پڑی ہوئی گتھی کو سلجھا دیا اور اب میرے لئے وہ الجھن باقی نہ رہی، کہ آپ کو کس صف میں جگہ دوں

مانا کہ مجھے آپ کے جذبات پر اقتدار حاصل نہیں، لیکن خدارا، یہ کہاں کا انصاف ہے کہ میں اپنے جذبات

کا خونِ صرف اس لئے کر دوں کہ آپ اُن سے متفق نہیں

میں غریب ہوں اور غریب الدیار بھی، جاہل بھی ہوں اور لاچار بھی، لیکن کیا کروں ، یہ بات کبھی سمجھ میں نہیں آئی کہ عقل آپ کی اور اعتماد میرا! جینے کا آخر یہ کونسا طریقہ ہے ـــــ بہرحال اگر جنس ناکارہ سمجھ کر میرے وجود کو نظر انداز کرنا آپ کے لئے ممکن نہیں تو

سرِ تسلیم خم ہے جو مزاجِ یار میں آئے

حبیب مکرم

پھلوں کے بھیجنے کی زحمت نہ اختیار کیجئے۔ کیونکہ اوّل تو میں اتنا شائق نہیں ، دوسرے یہ کہ بغیر آپ کی معیت کے وہ ہضم بھی نہ ہوں گے ۔ ہاں ایک صورت مفاہمت کی ہے اور وہ یہ کہ پہلے میں آپ کو یہاں سے شریفے بھیجوں اور جب آپ اپنی پسندیدگی کا اظہار فرماتے ہوئے میرا شکریہ ادا کریں تو میں جواب میں لکھوں کہ حضرت محض شکریہ سے کام نہیں چلتا ، سفیدہ اور دسہری بھیجئے ـــــ ہرچند میں پھر بھی زیر بار احسان رہوں گا ، لیکن کم از کم یہ اطمینان تو مجھے رہے گا کہ جو کچھ کھا رہا ہوں اس کے حصول میں تھوڑی بہت قوتِ بازو میں نے بھی صرف کی ہے ـــــ آپ باور کیجئے کہ یوں مجھے خاک مزا نہ آئے گا

اس لئے کہ فضول خط و کتابت میں وقت نہ ضایع ہو۔ اس عریضہ کے ساتھ ۳۰ سیر شریفوں کی بلٹی ملفوف کرتا ہوں۔ اس جوار کا یہ پھل اتنا ہی مشہور و لذیذ ہے جتنا اودھ کا سفیدہ ، گو مزہ کے نوعیت کو دیکھتے ہوئے دونوں کا تقابل درست نہ ہو ـــــ اور ہاں ، یہ کہنا بھول گیا کہ یہ پھل آپ کے لئے نہیں بھیجتا ۔ بلکہ اپنے بھتیجوں اور بھتیجیوں کے لئے بھیج رہا ہوں ۔ بھابھی کو بھی چکھنے کی اجازت نہیں

کرم گسترا

کس منھ سے شکر کیجئے اس لطفِ خاص کا

کہ پائے سخن بھی درمیان ہے اور سرِ چارہ فرمائی بھی ! ـــــ یعنی خود بھی لطف فرماتے ہیں اور دوسروں کو بھی آمادہ کرتے ہیں ـــــ حیران ہوں کہ وہ خدا جس کے بندے اسقدر بندہ نواز ہوں ، وہ خود اتنا بے نیاز ہو! بے نیازی سے میری مراد مستغنی اور بے پرواہ ہونا ہے کہ میں مر رہا ہوں اور اسے فکر نہیں ، میں ایڑیاں رگڑ رہا ہوں اور اُدھر سے کوئی تسکین نہیں ـــــ شاید خدا اور خداوند میں یہی فرق ہوگا اور اس لئے مجھے کہنے دیجئے کہ

تم خداوند ہی کہلاؤ خدا اور سہی

یہ تو خیر سب کچھ ہوگیا، لیکن یہ فرمائیے کہ میری " طبع اندوہگیں " کا کیا علاج ہے۔ اگر باوجود ان تمام الطاف و عنایات کے میری سوگواریاں بدستور قائم رہیں تو پھر میں کیا کروں گا۔ اس لئے خدا کے لئے کوئی شکل تو ایسی رہنے دیجئے کہ میں آپ کو صورت دکھا سکوں ـــــــ باور کیجئے میں ہرگز مستحق نوازش نہیں، مجھ پہ احسان کرنا مجھے ہلاک کرنا ہے ـــــــ نمرود کی خدائی میں رہتا ہوں اور اسی میں جان دینا پسند کرتا ہوں۔ آپ کیوں اپنا دل دکھائیں

جانِ نیاز

قاصد پہونچا، اور دفعۃً آپ کا باندہ چلا آنا معلوم ہوا ـــــــ اتنی بڑی قربانی اور میرے لئے ! اُف آپ کی جس محبت سے جان بچا کر میں یہاں چلا آیا تھا، وہ اب اس خطرناک حد تک پہونچ گئی !

دلے دارم خراب از التفاتِ چشمِ بیمارت
ہمہ از جور می ترسند و من از لطفِ بسیارت

میری مجبوریاں آپ سے مخفی نہیں، اس لئے اب آپ ہی بتائیے کہ ان حالات میں کیا کر سکتا ہوں۔ یہ تو ہو سکتا ہے کہ میں وہاں آکر آپ پر سے قربان ہو جاؤں، لیکن یہاں آپ کو بُلانا امکان سے باہر ہے، اگر آپ کا اچے گڈھ سے چلا آنا بغیر اجازت کے ہوا ہے تو بھی واپسی میں حرج نہیں، زیادہ سے زیادہ دو چار اشک ندامت کافی ہوں گے۔ اور اگر اجازت حاصل کر لی گئی ہے تو پھر کوئی جھگڑا ہی نہیں۔

اوّل تو مجھے یقین نہیں کہ مہاراج کو حقیقت کا علم ہو گیا ہے اور اگر تھوڑی دیر کے لئے اس کو صحیح باور کر لیا جائے تو بھی " حقیقت سے انکار " آپ کے لئے چنداں مشکل نہیں۔ آنسو بہا کر نہ سہی، بپھر کر، بگڑ کر، تیوریوں پر بل ڈال کر سہی

میں خود باندہ آکر آپ سے زبانی گفتگو کرتا، لیکن وہاں میرا آنا مناسب نہیں اس لئے اب چارۂ کار بجز اس کے کیا ہے کہ پھر وہیں واپس جائیے، اور مجھے اطلاع دیجئے کہ کیا رنگ ہے۔ ممکن ہے رخصت ختم ہونے پر میں بھی حاضر ہو جاؤں گو بظاہر اس کی امید کوئی نہیں

ظالم، اب کیا پوچھتے ہو کہ یہ سب کیونکر ہوا ـــــــ

شام کا وقت ہے، ہلکی ہلکی خنک ہوا چل رہی ہے، محل کے پائیں باغ میں روشوں پر ٹہل رہا ہوں، مہاراج کی طلبی کا انتظار ہے ـــــــ دفعۃً سامنے ایک مجسمۂ حُسن و رعنائی نظر آتا ہے ـــــــ ذی حیات، متحرک، نگراں،

خنداں ! ٹھیک اس وقت چوبدار آتا ہے اور میں چلا جاتا ہوں ــــــ لیکن یہ دو چیزیں اپنے ساتھ لے جاتا ہوں۔ ہلکے سانولے رنگ میں شفق کا انعکاس، اور طاؤس کی سی مستی رفتار!

اے جمال تو بہ تاراج نظر ہا گستاخ

اے خرام تو بہ پامالی سرہا گستاخ

بسنت کی صبح ہے، دربار میں رسم گلبازی کی طیاریاں ہو رہی ہیں، گلاب اور گیندے کے سُرخ و زرد پھولوں سے آنچل معمور ہیں، مہاراج برآمد ہوتے ہیں اور درباری راگنی کے ساتھ ہی یہ رسم شروع ہو جاتی ہے۔ تم کبھی آؤ گے تو دکھاؤں گا کہ اُس پھول کی پنکھڑی اب تک میرے پاس محفوظ ہے جو میرے سینہ پر پڑ کر ہمیشہ کے لئے ایک زخم چھوڑ گیا ــــــ آہ،

کتانِ خویشتن می شویم بہ مہتاب

خیر یہ تو وہ باتیں تھیں جن کا ذکر کچھ افسانوں ہی میں اچھا معلوم ہوتا ہے، لیکن قہر تو یہ ہے کہ میں اس سے زیادہ کچھ لکھ بھی تو نہیں سکتا

رگ سنگم شرارے می نویسم

کفِ خاکم غبارے می نویسم

رہا انجام و نتیجہ سو اب اس کے متعلق کیا عرض کروں

غالب نے ایک جگہ بنارس کا حال بیان کرتے ہوئے وہاں کی "قیامت قامتاں مژگاں درازاں" کا ذکر اس طرح کیا ہے

زرنگیں جلوہ ہا غارتگرِ ہوش

بہار بستر و نوروز آغوش

سو اگر مجھے یہ ڈر نہ ہوتا کہ تم رشک و حسد سے مر جاؤ گے تو میں بھی اس شعر کا دوسرا مصرعہ پڑھ کر خاموش ہو جاتا ــــــ لاحول ولا قوۃ، میں بھی کس قدر لغو و مہمل ہوں کہ ایک جھوٹ ختم نہیں ہوتا اور دوسرا شروع کر دیتا ہوں یقین کرو کہ یہ سب افسانہ نوازی کے سوا کچھ نہیں ــــ تم میری "سازگاری بخت"، سے اچھی طرح واقف ہو، اگر حقیقتاً ایسا ہو بھی تو یقین کرنے کی بات نہیں

لاحول ولا قوۃ، تم بھی کس درجہ پست ہمت واقع ہوئے ہو۔ صبح بہار میسر نہیں، تو شب ماہ میں کیا بُرائی ہے، جلوۂ سیرت کا فقدان ہے تو ہونے دو۔

خمِ زلف و شکنِ طرفِ کلاہ ہے درباب

تُف ہے تمھاری جوانی پر اور حیف ہے تمھارے شباب پر۔ گفتگو اصولی شروع ہو جائے گی اور غالباً ذاتیات تک پہونچ جائے، اس لئے خاموش رہتا ہوں، ورنہ کہتا میرے شیب و انحطاط سے اپنا شباب و عروج بدل لو، یا پھر اپنا نصیب مجھے دیدو، کہ کوئی ایک تو مکمل ہو جائے ——— مجھے فرصت نہیں ورنہ وہاں پہونچ کر بجائے مقال کے عمل سے اس نظریہ کی اہمیت ثابت کر دیتا

ہمارے "سلیم چشتی" کیسے ہیں ——— اگر ملاقات ہو تو کہدینا کہ "نفحات" کا نسخہ میرے پاس سے کہیں گم ہو گیا، مولانا جامی کے دستخط اگر اس پر ثبت نہ ہوتے تو بھی افسوس کرنا چاہئے تھا، لیکن اگر آج ملک الموت میری ہی روح قبض کرنے آجائیں تو کیا وہ مجھے بچا سکتے ہیں

بحمداللہ، میں صحیح و تندرست ہوں اور اسی لئے آپ کی صحت و عافیت کا طالب، ورنہ یوں بیمار پڑ جانے تو میں چاہتا ہوں کہ ساری دنیا میری طرح کراہنے لگے

آپ کی پرسش حال کا شکریہ، لیکن یہ آپ سے کہ کس نے دیا کہ میری حالت اس قدر سقیم ہے، اور پھر یہ کہ آپ کو میرا اتنا بڑا ہمدرد کیونکر جان لیا کہ ساری دنیا میں آپ ہی پر اس کی نظر انتخاب پڑی

اگر یہ صرف بہانہ ہے اجراء مراسلت کے لئے، تو خیر، ورنہ میں اس شخص کا نام معلوم کرنے پر اصرار کروں گا، جس نے یہ شگونِ بد منہ سے نکالا

عزیز یہاں نہیں ہیں، پرسوں اجمیر گئے ہیں۔ اگر جلد واپس آگئے تو آپ کا پیام پہونچا دوں گا، اور کوشش کروں گا کہ وہ آپ کو مایوس نہ کریں ——— لیکن اگر ان کی واپسی میں تاخیر ہوئی تو مجھے معذور سمجھئے کیونکہ میں خود آیندہ ماہ کی ابتدا میں یہاں سے باہر چلا جاؤں گا اور غالباً دو ماہ کے بعد واپسی ہو

منظومات کا مجموعہ نہ چھپا ہے اور نہ اس کے چھاپنے کا ارادہ۔ شعر کہنے سے قبل شعر سمجھنے کا سلیقہ نہ تھا اور جب یہ سلیقہ پیدا ہوا تو وہ زمانہ گزر گیا۔ میرے بعد لوگوں کو اختیار ہے

مذاکراتِ نیاز۔ یعنی حضرت نیاز کی ڈائری جو ادبیات و تنقید عالیہ کا عجیب و غریب ذخیرہ ہے۔ ایک بار اس کو شروع کر دینا اخیر تک پڑھ لیتا ہے اس کتاب کی بہت کم جلدیں باقی رہ گئی ہیں قیمت ۱۲ر (علاوہ محصول)

فلاسفۂ قدیم۔ اس مجموعہ میں حضرت نیاز کے تین علمی مضامین شامل ہیں (۱) چند گھنٹے فلاسفۂ قدیم کی روحوں کیساتھ (۲) مادئین کا مذہب (۳) حرکت کے کرشمے نہایت مفید و دلچسپ کتاب ہے قیمت عہر (علاوہ محصول)

مینجر نگار لکھنؤ

بیراگ کا بروگ

(۱)

راجکماری آئینہ کے سامنے ہلکے بنفشئی رنگ کی ساری پہنے بیٹھی ہوئی تھی، کنیزیں اسے سنوار رہی تھیں۔ لمبے لمبے بال سلجھائے جارہے تھے اور ان کی باتوں پر جو وہ کبھی ہنس پڑتی تھی تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ آئینہ کے اندر بجلی کی سی لہر دوڑ گئی۔ وہ اس وقت محل کے اس حصہ میں تھی جو اس کی خلوت و آزادی طلوت کے لئے مخصوص تھا

اس کا نام کملا تھا اور اس میں شک نہیں کہ وہ ایک کنول ہی کی طرح ——— اُس کنول کی طرح جو سطح آب سے اونچا ہوکر پتلی سی شاخ پر کھلتا ہے۔ نازک اور لچیلی تھی

اس نے پشت کی طرف کرسی پر اپنی ہنس کی سی گردن ڈال دی، موتیوں سے مانگ بھرنے کے لئے کنیز نے اپنا زریں ظرف سنبھالا اور راجکماری گنگنانے لگی۔ اس کی آواز میں ایسی جھنکار تھی جیسے چاندی کے برتن پر کوئی ضرب لگا دی جائے۔ سچے موتیوں کے باریک ذرّے اور مقیش کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے اس کے بالوں کے اندر ایسے نظر آتے تھے جیسے اندھیری رات میں جگنو چمک رہے ہوں ———

اس نے ایک آہ کے ساتھ گردن اٹھائی اور آئینہ کے سامنے بکھرے ہوئے بالوں کو سمیٹتی ہوئی، سینہ کے ہار کو سنبھالتی ہوئی بولی :— "تم نے تو آج مجھے تھکا دیا"، کنیزیں پیچھے خاموش کھڑی ہوئی مسکرا رہی تھیں ——— راجکماری نے دفعتہً پلٹ کر دیکھا اور ان سب کو مسکراتے ہوئے دیکھ کر خود بھی ہنس پڑی۔ کسی نے جلدی سے ساری کا آنچل سنبھال کر اس کے شانہ پر ڈالا، کسی نے ماتھے پر سُرخ بندی لگا دی اور کسی نے زرکار اطلس کی جوتی پاؤں میں پہنائی اور کملا آئینہ میں ایک اچٹتی ہوئی نگاہ ڈال کر اٹھ کھڑی ہوئی

کملا راجہ جگدیس پور کی لڑکی تھی اور راجپوتانہ بھر میں کوئی راجکماری اس کے حسن و جمال کو نہ پہونچتی تھی لوگ کہا کرتے تھے کہ راجکماری کملا کے اندر تو سرسوتی دیوی نے جنم لیا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ مُلک کے نوجوان جو کوئی توقع اس کی طرف سے قایم نہ کرسکتے تھے، یہ نہ کہتے تو کیا کرتے

(۲)

بلداؤجی کا مندر رتن گڈھ کا تاریخی مندر ہے اور اپنی وسعت تعمیر کے لحاظ سے بھی خاص شہرت رکھتا ہے۔ ہر سال یہاں پھاگن کی پورنماشی کو بڑا میلہ لگتا ہے اور دور دور سے لوگ جاترا کرنے آیا کرتے ہیں۔ مندر کے چاروں طرف فقیروں اور سادھوؤں کے قیام کے لئے مسلسل کوٹھریاں ہیں - اور ان کے سامنے چاروں طرف برآمدہ بنا ہوا ہے، جہاں تپسیا کرنے والے اور دنیا کو تج دینے والے سادھو گیان دھیان میں مصروف نظر آتے ہیں

صبح کا وقت ہے اور سیکڑوں عورتیں تھالیوں میں رنگ برنگ کے پھول رکھے ہوئے پوجا کے لئے آ جا رہی ہیں۔ مندر کی پشت پر جہاں نسبتاً بہت کم ہجوم ہے، راجکماری کملا اپنی دو کنیزوں کے ساتھ کھڑی ہوئی آنے جانے والوں کو دیکھ رہی ہے، متعدد تھالیاں پھولوں سے بھری ہوئی صحن کے گوشہ میں رکھی ہوئی ہیں۔ اور اس بات کا انتظار ہو رہا ہے کہ ہجوم کم ہو تو یہ پھول بھی شیو جی کے استھان پر چڑھا دئے جائیں۔ کملا کا معمول تھا کہ وہ کبھی کبھی شہر کی دوسری عورتوں کی طرح یہاں آتی اور آزادی کے چند لمحے بسر کر کے چلی جاتی - ہر چند بعض پجاریوں اور پنڈتوں کو اس کا علم تھا، لیکن آج تک وہ کبھی یہ نہ معلوم کر سکے تھے کہ وہ کب آتی ہے اور کب چلی جاتی ہے

راجکماری کملا تھک کر وہیں فرش پر بیٹھ گئی اور رُکمنی اور لیلا وتی سے آہستہ آہستہ باتیں کرنے لگی - راجکماری کملا نے مسکراتے ہوئے کہا "لیلا، سچ بتا جس وقت تو شیو جی پر پھول چڑھاتی ہے تو تیرے دل میں کیا آرزو ہوتی ہے"

لیلا —— "راجکماری، میں کیا اور میری آرزو کیا"

رکمنی —— "اور آرزو ہو بھی تو کیا، کبھی پوری ہوتے تو دیکھی نہیں"

کملا —— (ہنستے ہوئے) "رکمنی، خوب کہا - لیکن کیا میں سن سکتی ہوں کہ تیری کیا آرزو ہے جو شیو جی نے آج تک پوری نہیں کی"

رکمنی —— (افسردگی کے ساتھ) "راجکماری، کچھ نہیں، میں نے تو یونہی ایک بات کہدی - لیکن یہ جانتی ہوں کہ جو ہونا ہوتا ہے وہ بغیر پھول چڑھائے بھی ہو جاتا ہے اور جو بات ہونے والی نہیں، وہ کسی طرح نہیں ہوتی، چاہے کوئی لاکھ سر رگڑا کرے"

لیلا —— (پیشانی پر تیوریاں ڈال کر) "کیوں ایسی بات زبان سے نکالتی ہے، پرمیشر اگر سن لے تو نہ جانے کیا کرے"

اسی وقت دو عورتیں قریب سے گزریں - ایک دوسری سے کہہ رہی تھی - "بڑے گیانی سادھو ہیں، چرن چھوتے ہی میرا سب دُکھ جاتا رہا، یہ معلوم ہوتا تھا گویا آنکھوں میں نیند سی بھری جا رہی ہے - تم بھی چلو کل صبح چل کر درشن

کرلو، وہیں تم سے قریب ہی رام گوپھا میں رہتے ہیں"

کملارانی دیر تک خاموش کچھ سوچتی رہی اور بغیر پھول چڑھائے ہوئے واپس چلی گئی

(۳)

مہاراجہ ——— " مجھے سوامی جی کا حال بالکل نہیں معلوم، لیکن تم ان سے ملنا چاہتی ہو تو میں انھیں یہیں بُلاتا ہوں اچھا ہے میں بھی مل لوں گا"

کملا ——— " مہاراج، جو لوگ دنیا چھوڑ چکے ہیں اُن سے دنیاوی جاہ وجلال کے ساتھ ملنا مناسب نہیں میں ان پر یہ ظاہر کرنا نہیں چاہتی کہ میں کون ہوں"

مہاراجہ ——— (مسکراکر) " تمھاری اس آزاد طبیعت سے جگدیس پور والے بھی کچھ واقف ہو چلے ہیں۔ اور تمھیں معلوم ہے کہ وہ کیسے پرانے خیال کے لوگ ہیں۔ صرف ایک مہینہ باقی ہے کہ تم انھیں کے بس میں ہوگی اس لئے مناسب نہیں کہ ان کو تمھاری طرف سے کسی بُرے خیال قائم کرنے کا موقع ملے۔ محلوں کی ذرا سی بات بھی کوٹھوں کوٹھوں پھرتی ہے"

یہ سنکر راجکماری کملا کے چہرہ پر انفعال و برہمی کی ملی ہوئی کیفیت کا ایک خاص رنگ پیدا ہو گیا۔ اور تھوڑی دیر خاموش رہنے کے بعد جو حقیقتاً اس کے انتہائی ضبط و تامل کو ظاہر کر رہا تھا

بولی ——— " سچ ہے مہاراج، لڑکی ہر جگہ لڑکی ہے، خواہ وہ راجہ کے گھر میں پیدا ہو، یا کسان کے جھونپڑے میں، عورت کی کمزوری، قدرت کی وہ بے اعتمادی ہے جس کا علاج اس دنیا میں ممکن نہیں، بہتر ہے میں نہ جاؤں گی، لیکن سوامی جی کو بھی یہاں آنے کی تکلیف نہ دیجئے، اور رتن گڈھ کو جگدیس پور نہ بنائیے"

یہ کہکر راجکماری کملا جانے ہی والی تھی کہ اس کے باپ نے اس کو روک لیا اور بولا کہ " کملا میرا مطلب یہ نہ تھا کہ تم وہاں نہ جاؤ، میں نے تو یوں ہی ایک بات کہہ دی تھی، تم آزردہ نہ ہو۔ میں تمھاری خوشی کے لئے دنیا کی ہر مصلحت کو قربان کر سکتا ہوں بشرطیکہ رتن گڈھ کی عزت پر حرف نہ آئے"

(۴)

یوں تو رتن گڈھ کوہستان بندھاچل کے دامن میں واقع ہے لیکن اس کی آبادی پہاڑ کی بلندی تک پھیلی ہوئی ہے۔ جہاں قلعہ اور رنواس کی عمارتیں بھی نظر آتی ہیں۔ سب سے بلند مقام رام گوپھا کے نام سے مشہور ہے۔ کہا جاتا ہے کہ جب سری رام جی نے لنکا پر فوجکشی کی تھی تو اسی راستہ سے گزرے تھے اور یہاں ایک رات دن قیام کیا تھا

صبح کا وقت ہے، اور گو آفتاب کافی بلند ہو گیا ہے، لیکن موسم کی خنکی کی وجہ سے ابھی تک زیادہ چہل پہل کہیں نظر نہیں آتی

رام گوپھا ایک وسیع کھوہ ہے جس نے ایک وسیع کوٹھری کی صورت اختیار کر لی ہے اور قدرت نے اس کے آگے ایک بڑی چٹان کی چھت قائم کر کے اچھا خاصہ برآمدہ بھی بنا دیا ہے، جگہ نہایت صاف، ستھری ہے اور چاروں طرف سبز جھاڑیوں کی وجہ سے گرمی میں بھی یہ جگہ کافی خنک رہتی ہے۔ قریب ہی ایک سنگستانی چشمہ ہے جو ہمیشہ جاری رہتا ہے اور بہت متبرک سمجھا جاتا ہے۔ یہ گوپھا عرصہ سے غیر آباد تھا، لیکن چند دن سے سوامی رام ناتھ، بنگال کے مشہور سنیاسی فقیر یہاں آکر ٹھہر گئے ہیں

سوامی رام ایک دولتمند باپ کے بیٹے اور تعلیم یافتہ خاندان کے فرد تھے۔ ان کی ابتدائی زندگی ایسے ماحول میں بسر ہوئی تھی جسے نہ مذہب سے کوئی سروکار تھا اور نہ سنیاس سے، لیکن چونکہ وہ فطرت کی طرف سے نہایت سنجیدہ اور سوچنے والا دماغ لے کر آئے تھے۔ اس لئے وہ اپنے ماحول اور عیش و تنعم کی فضا سے بہت کم متاثر ہوئے تھے اور ان کی زندگی کافی سادہ بسر ہوئی تھی، جب ان کا مطالعہ وسیع ہوا تو ان کی یہ فطری سادگی اور زیادہ ظاہر ہونے لگی، یہاں تک کہ آخرکار ایک گیروے رنگ کی چادر کے سوا ان کے جسم پر کوئی کپڑا نہ رہ گیا

ہر چند ان کے باپ جو رنگ پور کے مشہور سر برآوردہ زمیندار تھے، اپنے بیٹے کی اس زندگی سے خوش نہ تھے اور انھوں نے بارہا اس موضوع پر گفتگو بھی کی، لیکن رام ناتھ کا وہ گہرا سکوت جس میں عجیب طرح کی کیفیت مقاومت پنہاں تھی، ایک ایسا فیصلہ کن جواب ہوا کرتا تھا کہ آخرکار یہ تعرض چھوڑ دیا گیا اور وہ اپنی عمر کے چوبیس سال تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد دفعۃً گھر سے غائب ہو گئے

رام ناتھ گھر سے نکلنے کے بعد کہاں گئے، کہاں کہاں کی خاک چھانی، اور کس کس جگہ گیان دھیان میں مصروف رہے، یہ ان کی زندگی کی وہ باتیں ہیں جن کا علم صرف انھیں کو حاصل تھا، جس وقت وہ رتن گڈھ آئے ہیں ان کی عمر ۳۲ سال کی تھی اور سوائے کتابوں کے انبار کے کوئی اور سامان ان کے ساتھ نہ تھا

صورت و شکل کے لحاظ سے ان میں کوئی غیر معمولی بات نہ پائی جاتی تھی، لیکن چونکہ ابھی شباب کا زمانہ تھا اور شباب بھی ایک سنیاسی کا، اس لئے ان کی صورت میں ایک عجیب قسم کی کشش پائی جاتی تھی، اور آنکھوں کی کشش کا تو یہ عالم تھا کہ آنکھ میں آنکھ ڈال کر ان کا باتیں کر لینا۔ بڑے بڑوں کے قدم اکھاڑ دیتا تھا ان کا رنگ کھلا ہوا گندمی تھا، اور قامت و اعضاء کے لحاظ سے ایک چھریرے سڈول جسم کے انسان تھے

کملا جس وقت رکمنی کے ساتھ وہاں پہونچی تو سوامی جی اپنے مطالعہ میں مشغول تھے اور کوٹھری کے اندر بیٹھے ہوئے تھے ———

رکمنی نے دستک دی اور تھوڑی دیر میں وہ باہر نکلے، لیکن اس شان سے کہ ہاتھ میں کوئی کتاب تھی اور ان کی بڑی بڑی آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے تھے۔ کملا نے ان کو دیکھتے ہی نگاہیں نیچی کرلیں اور وہ اپنی جگہ ٹھٹک کر رہ گئی۔ سوامی جی عورتوں کی آمد و رفت کبھی پسند نہ کرتے تھے اور حتی الامکان اس سے بہت گریز کرتے تھے کہ عورتوں سے انھیں خطاب کرنا پڑے، اس لئے دستک سننے کے بعد جب وہ باہر نکلے اور انھوں نے دو عورتوں کو کھڑا ہوا دیکھا تو وہ گھبرا سے گئے۔ لیکن چونکہ وہ باہر آگئے تھے اس لئے اب واپس بھی نہ جا سکتے تھے۔ لاچار کونہ میں ایک جگہ بیٹھ گئے اور ان کو بھی بیٹھ جانے کا اشارہ کیا

رکمنی نے بڑھ کر اُن کے پاؤں چھونا چاہے، لیکن انھوں نے روک دیا اور بولے کہ "دیویو، میرے چرنوں میں کیا رکھا ہے، ہندو دھرم میں غیر کی پوجا حرام ہے"

رکمنی —— "سوامی جی، یہ تو پرمیشر کی پوجا ہے آپ کے چرنوں کی نہیں"

سوامی جی —— "پرمیشر کہاں ہے جس کی پوجا کرتی ہو، انسان خود پرمیشر ہے، اور اس کو خود اپنی ہی پوجا کرنا چاہئے"

کملا سوامی جی کے منہ سے یہ باتیں سُنکر حیران رہ گئی اور اس نے اپنی زندگی میں سب سے پہلے اس آواز کو سُنا جو زمانہ نا معلوم سے اس کے دل و دماغ میں گونج رہی تھی لیکن لب تک نہ آ سکتی تھی۔

اس نے کہا —— "سوامی جی، اپنی پوجا کا کیا طریقہ ہے"

سوامی جی —— (مسکراتے ہوئے) "تم نے اپنی صورت کبھی آئینہ میں دیکھی ہے؟"

کملا —— (انفعال کے ہلکے رنگ کے ساتھ) "جی ہاں، روز ہی دیکھتی ہوں"

سوامی جی —— "تمھیں وہاں کیا نظر آتا ہے"

کملا —— "ایک صورت نظر آتی ہے"

سوامی —— "کس کی"

کملا —— "اپنی"

سوامی —— "وہ چیز جسے تم "اپنی" کہتے ہو کیا ہے، کہاں ہے، کیا "میں" نام خوبصورت چہرہ کا ہے، بڑی بڑی آنکھوں اور گورے گورے رنگ کا ہے؟ یہ تمام باتیں تو چند دن میں مٹ جانے والی ہیں، تو کیا "میں" بھی ان کے ساتھ فنا ہو جاتا ہے"

کملا —— "بظاہر تو یہی معلوم ہوتا ہے، گو ہونا تو نہ چاہئے"

سوامی —— "کبھی سمندر تم نے دیکھا ہے"

کملا —— "جی ہاں، دیکھا ہے"

سوامی ——— " کیا تم سمجھتی ہو کہ وہ قطروں کا مجموعہ نہیں، لیکن سمندر نام قطرہ کا تو نہیں۔ قطرہ جب تک سمندر میں شامل ہے خود بھی سمندر ہے، اور جب اس سے علیحدہ ہو گیا تو وہ ایک فانی قطرہ ہے، درانحالیکہ سمندر بدستور اسی طرح قائم ہے۔ اسی طرح " میں " نام نہ تمہاری صورت کا ہے اور نہ میری صورت کا، نہ تمہاری ایک ذات کا، نہ میری تنہا ہستی کا، بلکہ اس کُل کا جو " ہم سب " کے پردہ میں ظاہر ہوا ہے، درانحالیکہ وہ " ہم " نہیں ہے۔ اسی کُل کا دوسرا نام " پرمیشور " ہے اور جب تک ہم اس میں شامل ہیں، خود بھی " پرمیشور " ہیں اور اس لئے اپنی پوجا کرنا پرمیشور کی پوجا کرنا ہے

کملا ——— " مہاراج، یہی تو میں پوچھتی ہوں کہ اپنی پوجا کیونکر کی جائے "

سوامی ——— " تم نے کبھی آدھی رات کو جنگل کا سناٹا دیکھا ہے، جبکہ کہیں کسی طرف سے کوئی آواز نہیں آتی "

کملا ——— " جی ہاں، دیکھا ہے "

سوامی ——— " پھر تم نے کبھی غور کیا ہے کہ اس انتہائی سکوت کی بھی ایک آواز ہوتی ہے، اس گہری خاموشی میں بھی ایک خاص قسم کی سرگوشی سی پائی جاتی ہے۔ انسان بھی اگر دھیان سے کام لے کر خود اپنی خلوت میں ڈوب جائے، تو وہ بھی خاص قسم کی آواز اپنے اندر سے پیدا ہوتے ہوئے سُن سکتا ہے اور محسوس کر سکتا ہے کہ وہ آہستہ آہستہ کائنات میں وسیع ہوتا جا رہا ہے اور پرمیشور کی طرح سب پر چھایا جا رہا ہے "

کملا ——— " اگر ایسا ہو بھی جائے تو اس سے نتیجہ کیا ہے "

سوامی ——— " نتیجہ کا سوال، منزل کا سوال ہے، اور منزل کا سوال قطع جستجو کا "

سوامی جی کی آنکھوں میں آنسو آ گئے، اور سر جھکا کر خاموش ہو گئے۔ کملا بھی اپنے جسم میں ایک خاص قسم کی جھرجھری محسوس کر رہی تھی اور جس وقت رخصت ہوتے وقت سوامی جی نے اس کو اپنی اشک آلود آنکھوں سے دیکھا تو وہ کانپنے لگی اور اس طرح گھر کی طرف لوٹی گویا اس کی کوئی چیز کھو گئی ہے اور وہ سمجھنا چاہتی ہے کہ وہ کیا چیز ہے (باقی)

نیاز

فراست التحریر مکمل یعنی اُردو، انگریزی رسم الخط اور انداز تحریر دیکھ کر ایک شخص کی سیرت، چال چلن مستقل اور تمام حالات معلوم کرنے کا فن۔ اُردو میں بالکل پہلی کتاب قیمت ۸/ (علاوہ محصول)

منیجر نگار لکھنؤ

میکدۂ اسلام

اور

اڈیٹر سہیل یمن کی بہکی بہکی باتیں

لکھنؤ سے ایک شیعی رسالہ "سہیل یمن" جناب ظفر مہدی صاحب کی ادارت میں برسوں سے شایع ہو رہا ہے اور اسی ذہنیت کے ماتحت جو اخبار "النجم" کی ہے۔ یعنی شیعہ سنیوں کے درمیان تفریق و اختلاف کی خلیج کو وسیع کرتے رہنا اور کبھی کوئی ایک بات بھی سمجھ کی ایسی نہ کرنا جسے صحیح معنی میں دینی یا انسانی خدمت کہا جائے

"میکدۂ اسلام" ایک مختصر سا رسالہ ہے۔ جو انھیں کی قوت فکر و اجتہاد کا نتیجہ ہے اور خصوصیت کے ساتھ میرے پاس اس لئے بھیجا گیا ہے کہ اس میں جا بجا میرا اور "نگار" کا بھی ذکر آیا ہے

اس رسالہ کا مقصود اس مسئلہ پہ گفتگو کرنا ہے جو جناب امیر کی شراب نوشی سے متعلق ہے اور جس کا ذکر مولانا شبلی نے بھی کیا ہے۔ مجھ پر یہ الزام ہے کہ میں نے بھی اس کی تائید کی

میکدۂ اسلام میں شبلی کی تحقیق کو غلط ثابت کرتے ہوئے جن جن دور از کار مباحث و مسائل پر خامہ فرسائی کر کے ذوق سب و شتم کو پورا کیا گیا ہے، اُن سے اعتنا کرنا میرا فرض نہیں، کیونکہ وہ سب شیعہ و سُنی کی اُس دیرینہ نزاع سے متعلق ہیں جس کا خیال بھی میرے لئے حد درجہ تکلیف دہ ہے چہ جائیکہ اس کی حمایت یا مخالفت میں قلم اٹھانا لیکن چونکہ صاحب رسالہ نے میرے خلاف ایک نہایت لغو و غلط الزام مولانا شبلی کی تائید کا قائم کیا ہے اس لئے اس کو رفع کر دینا ضروری سمجھتا ہوں

سنہ ۴۲ء میں ایک صاحب نے استفسار کیا کہ رسالۂ سہیل یمن میں جناب عمر کے متعلق "شراب صلب" کا پینا کتب اہل سنت سے ثابت کیا گیا ہے، سو اس کی کیا اصلیت ہے" میں نے اس کا جواب دیتے ہوئے ایک جگہ

یہ ظاہر کیا تھا کہ

" سہیل یمن کے اس مضمون کا ماخذ عقد الفرید ہے یا عقد الفرید کے حوالہ سے " ابن قتیبہ " لیکن مقالہ نگار نے دیانت سے کام لے کر نہ عقد الفرید کی پوری بحث پیش کی اور نہ ابن قتیبہ کی عبارت نقل کی، کیونکہ اگر ایسا کیا جاتا تو اصل مقصود فوت ہو جاتا اور حضرت عمر پر بادہ خواری کا الزام اسقدر صفائی سے عائد نہ ہو سکتا "

اسی سلسلہ میں میں نے ایک جگہ یہ بھی لکھا تھا

" یہ بالکل صحیح ہے کہ آیت " یسئلونک عن الخمر ـــــــ " نازل ہونے سے پہلے عام طور پر لوگ شراب کے عادی تھے اور اس آیت کے نازل ہونے پر بھی سب نے اسے ترک نہیں کیا تھا، لیکن ایک مرتبہ جب یہ واقعہ پیش آیا کہ کسی صحابی نے (اور بعض کے نزدیک خود حضرت علی نے) نماز مغرب بہ حالتِ سُکر پڑھائی اور قرات میں غلطی ہو گئی تو آیت " لاتقربوا الصلوٰۃ وانتم سکاریٰ " نازل ہوئی۔۔۔۔۔ "

میرے اس جواب میں (جو مئی ۳۰ء کے نگار میں درج ہوا ہے) ایک بات تو مدیر سہیل یمن کو یہ ناگوار ہوئی کہ میں نے اُن پر مناظرانہ دیانت سے انحراف کرنے کا الزام قایم کیا تھا اور دوسری یہ کہ بہ حالتِ سُکر نماز پڑھانے والے صحابی کا ذکر کرتے ہوئے۔ میں نے یہ بھی لکھ دیا تھا کہ بعض کے نزدیک یہ صحابی خود حضرت علی تھے

اب کامل سات سال گزرنے کے بعد ظفر مہدی صاحب " میکدۂ اسلام " شایع کرتے ہیں اور اس میں اپنی دیانت کے مسئلہ کو نظر انداز کرتے ہوئے صرف جناب امیر کے واقعۂ شراب نوشی کو لے کر مجھے بھی مولانا شبلی کی طرح موردِ الزام قرار دیتے ہیں، درانحالیکہ حقیقت بالکل اس کے خلاف ہے

میں نے صرف اتنا لکھا تھا کہ بعض کے نزدیک خود حضرت علی نے بہ حالتِ سُکر نماز مغرب پڑھائی تھی، لیکن اس سے میرا مدعا یہ ظاہر کرنا نہ تھا کہ میں بھی اُن " بعض " سے متفق ہوں، جس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے۔ کہ اس سے قبل ہی صراحۃً اس باب میں مولانا شبلی کے خلاف اظہارِ خیال کر چکا تھا ـــــــ

اگست و ستمبر ۳۵ء کے مسلسل دو اشاعتوں میں جناب سید وصی احمد صاحب بلگرامی کا ایک مضمون " ملک خطا کے شہزادے " کے عنوان سے نگار میں شایع ہوا تھا اور پہلا اعتراض مولانا شبلی پر انھوں نے یہی کیا تھا کہ

" آیت لاتقربوا الصلوٰۃ کی شان نزول میں ابوداؤد سے جو روایت انھوں نے نقل کی ہے اور حضرت علی کے واقعۂ بادہ نوشی کا ذکر کیا ہے، حد درجہ قابل ملامت ہے۔ اور وہ حدیث اس قابل نہ تھی کہ اس سے استدلال کیا جاتا۔۔۔۔۔ "

میں نے اس پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے لکھا تھا کہ

" اس مسئلہ میں کئی باتیں غور طلب ہیں

(۱) ابوداؤد کے علاوہ کسی اور ذریعہ سے بھی یہ حدیث روایت ہوئی یا نہیں

(۲) اس کے راوی مجروح ہیں یا نہیں

(۳) آیۂ لاتقربوا الصلوٰۃ کی شان نزول یہی واقعہ ہے یا کوئی اور

(۴) مفسرین کی اس باب میں کیا رائے ہے

ابوداؤد کے علاوہ ترمذی میں بھی یہی واقعہ موجود ہے۔ لیکن ذرا اختلاف کے ساتھ۔ ابوداؤد کے الفاظ یہ ہیں

" عن علی ابن ابی طالب ان رجلاً من الانصار دعاہ (علی) وعبدالرحمٰن بن عوف فسقاھما قبل ان تحرم الخمر فامھم علی فی المغرب وقرا قل یا ایھا الکفرون، فخلط فیھا، فنزلت لاتقربوا الصلوٰۃ الخ "

یعنی شراب حرام ہونے سے قبل حضرت علی اور عبدالرحمٰن بن عوف کو کسی انصاری نے مدعو کیا۔ اور ان کو شراب پلائی۔ پھر مغرب کی نماز میں حضرت علی نے امامت کی اور اثنائے قرائت میں " قل یا ایھا الکفرون " غلط پڑھ گئے جس پر آیۂ " لاتقربوا الصلوٰۃ " نازل ہوئی (ابوداؤد کتاب الاشربہ صفحہ ۱۶۱ جلد دوم مطبوعہ نولکشور)

ترمذی کے الفاظ یہ ہیں:-

" عن ابن ابی طالب صنع لنا عبدالرحمٰن بن عوف طعاماً ودعانا وسقانا من الخمر فاخذت الخمر منا وحضرت الصلوٰۃ فقدمونی فقرأت قل یا ایھا الکفرون ولا اعبد ما تعبدون ونحن نعبد ما تعبدون قال فانزل اللہ تعالیٰ یا ایھا الذین آمنوا لاتقربوا الصلوٰۃ وانتم سکاریٰ الخ "

(ترمذی جلد دوم صفحہ ۱، مطبوعۂ مصر)

ابوداؤد نے یہ واقعہ مسدد سے روایت کیا ہے اور ترمذی نے سوید سے۔ ابوداؤد کی روایت سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ کسی انصاری نے حضرت علی اور عبدالرحمٰن بن عوف کی دعوت کی تھی۔ اور ترمذی کی روایت سے عبدالرحمٰن بن عوف کا دعوت کرنا پایا جاتا ہے۔ ابوداؤد میں مغرب کے وقت کی تصریح ہے۔ اور ترمذی میں کسی وقت کا ذکر نہیں

بخاری اور ابن ماجہ میں یہ روایت نہیں پائی جاتی۔ نسائی میں اس آیت کی شان نزول کے متعلق ایک اور واقعہ نقل کیا ہے جو ابوداؤد میں بھی ہے لیکن حضرت علی کی شراب نوشی اور دعوت کا کوئی ذکر نہیں ہے

انوار التنزیل میں " لاتقربوا الصلوٰۃ " کی جو شان نزول بیان کی ہے۔ وہاں بھی حضرت علی کا کوئی ذکر نہیں ہے اس میں لکھا ہے کہ :-

" عبدالرحمٰن بن عوف نے جس زمانہ میں شراب حرام نہیں ہوئی تھی کسی صحابی کو مدعو کیا اور سب نے

مل کر کھانا کھایا، اور شراب پی یہاں تک کہ خوب سیر ہو گئے، اور نماز مغرب کا وقت آگیا۔ ان میں سے کوئی نماز پڑھانے لگا۔ اور اثنار قرأت میں "اعبد ما تعبدون" پڑھ گیا، جس پر آیۂ "لاتقربوا الصلوٰۃ" نازل ہوئی"۔[1]

اسی طرح علامہ زمخشری اور امام رازی وغیرہ نے اس واقعہ کو بیان کیا ہے۔ لیکن حضرت علی کی شراب نوشی کا کہیں ذکر نہیں ہے۔ امام رازی نے آیۂ "لاتقربوا الصلوٰۃ" کے متعلق حضرت ابن عباس کی ایک اور روایت نقل کی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ قبل حرمت خمر صحابہ شراب پی کر مسجد میں آتے تھے۔ اور نماز پڑھتے تھے۔ پس اللہ نے ان کو اس آیت کے ذریعہ سے منع کیا

دُرِ منثور میں ایک جگہ سبب نزول وہی واقعہ حضرت علی کا نقل کیا ہے اور دوسری جگہ ضحاک اور ابن عباس کو سکر نوم یعنی نعاس سبب نزول قرار پایا ہے

بہر حال آیۂ "لاتقربوا الصلوٰۃ" کی شان نزول میں مفسرین کا اختلاف ہے اور چونکہ ابو داؤد اور ترمذی میں حضرت علی کے واقعۂ بادہ نوشی ہی کو اس آیت کا سبب نزول قرار دیا ہے اور دوسری روائتیں اس کی معارض واقع ہیں۔ اس لئے ہمارے نزدیک حدیث قابل اعتبار نہیں ہے۔ اور اس پر اعتماد کرکے ہم حضرت علی کے متعلق یقینی طور پر یہ نہیں کہہ سکتے کہ انھوں نے شراب پی۔ اور مولانا شبلی نے یقیناً اس معاملہ میں کاوش نہیں کی اور ابو داؤد کی اس حدیث کو صرف اس بنار پر کہ اس کے راوی غیر مجروح ہیں اختیار کر لیا

یہ تھے میرے خیالات اس خاص واقعہ کے متعلق جو میں فروری ۱۹۲۶ء کے نگار میں ظاہر کر چکا تھا لیکن سہیل یمن کے وہ فاضل و مجاہد مدیر جو حضرت عمر پر شراب نوشی کا الزام عاید کرتے ہوئے عقد الفرید کی پوری عبارت نقل کرنے میں خیانت سے کام لے سکتا تھا وہ میرے باب میں کیوں دیانت سے کام لیتا اور کیوں میرے اصل خیال کو پیش کرتا ــــــ

یہ ہے ہمارے مناظرہ کرنے والے مولویوں کی ذہنیت و قابلیت کا حال، اور یہ ہیں ان کی مبلغانہ راستبازیاں، جن سے وہ سپید کو سیاہ ثابت کرنے کی کوشش میں کام لیتے رہتے ہیں ــــ اصل موضوع کے متعلق جناب ظفر مہدی صاحب نے اس "میکدۂ اسلام" میں کیا لکھا ہے، اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ میں نے حضرت عمر کے شراب نوشی کے متعلق جو کچھ ۱۹۲۷ء میں لکھا تھا۔ اس میں کسی ایک بات کا بھی جواب جناب ظفر مہدی صاحب سے بن نہ پڑا اور سات سال کی مسلسل فکر و کاوش کے بعد بھی سوائے چند ان مزخرفات

---

[1] انوار التنزیل جلد دوم صفحہ ۸۸ مطبوعہ مصر و مفاتیح الغیب الرازی جلد دوم صفحہ ۴۴ مطبوعہ مصر

کے جو متعصب مولویوں کی طرف سے اکثر و بیشتر ظاہر ہوتے رہتے ہیں۔ وہ کوئی ایک بات بھی لایق اعتناء پیش نہ کرسکے

حضرت نیاز کے ادبی شاہکاروں کا مجموعہ

جمالستان

(نگارستان کا دوسرا حصہ حجم ۵۰۰ صفحات)

قیمت فی کاپی مجلد للعہ غیر مجلد للعہ ر علاوہ محصول

خریداران نگار سے ایک روپیہ کی رعایت

کتب فروشوں کو ۲۵ فی صدی کمیشن

فہرست مضامین حسب ذیل ہے:۔

دنیا کا اولین بت ساز	فریب خیال	صدائے شکست	دو گھنٹے جہنم میں
ایک شاعر کی محبت	میر بیدانہ	تاریخ عرب کی ایک روایت جمیل	ایثار
شہید آزادی	بعد المشرقین	ولے بخیر گزشت	ٹیلی فون نمبر ۶۷۰
دو خط	جالنعالم اور ملکہ مہر نگار	چند گھنٹے ایک مولوی کے ساتھ	شبنمستان کا قطرۂ گوہریں
سودائے خام	درس محبت	ازدواج مکرر	انتظام علی صاحب
۲۵ھ کا ایک صوفی	ایک شاعر کا انجام	آدم و حوا سے پہلے	شہزادۂ خرم اور ابابیل
زہرہ کا ایک پجاری	رادھا	سرزمین دکن کی ایک دلنواز شام	نوجوان شہزادہ
مطربۂ فلک	چنگاری	محلہ کی رونق	داستان حسن و عشق کا ورق خونیں

منیجر نگار لکھنؤ

باب الانتقاد

تعلیمات قرآن اپنی نوعیت کی پہلی کتاب ہے جسے مولانا اسلم جیراجپوری نے مرتب کرکے ان لوگوں کے لئے جو قرآن کو قرآن ہی سے سمجھنا چاہتے ہیں بڑی آسانیاں پیدا کردی ہیں

قرآن کی تعلیم کا اسلوب زمانۂ دراز سے اس وقت تک یہی چلا آرہا ہے کہ چند مخصوص تفاسیر کو سامنے رکھ کر اس کے مطالب سمجھائے جاتے ہیں۔ نہ مدرس خود غور و تامل سے کام لیتا ہے، نہ طلبہ کو اس طرف مائل کیا جاتا ہے گویا قرآن سے پہلے تفاسیر پر ایمان لے آنا ضروری ہوتا ہے اور چونکہ تفاسیر کا ماخذ بالعموم کتب احادیث ہیں جن میں کثرت سے موضوع روایات پائی جاتی ہیں، اس لئے نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ قرآن سمجھنے کی صحیح اہلیت طلبہ میں پیدا ہی نہیں ہوتی اور کورانہ تقلید اُن کی قوت فکر و اجتہاد کو یکسر محو کردیتی ہے

عام طور پر مسلمانوں میں یہ غلط خیال پیدا ہوگیا ہے (جو یقیناً مولویوں ہی کی تعلیم کا نتیجہ ہے) کہ قرآن کو سمجھنا ہر شخص کا کام نہیں اور اسلاف جو کچھ بتا گئے ہیں اس سے انحراف کرنا قرآن و رسول سے منحرف ہوجانا ہے

یہ خیال خود قرآنی تعلیم کے منافی ہے، کیونکہ وہاں تو ہر جگہ ہر انسان کو غور و فکر تدبر و تامل کی تعلیم دی جاتی ہے۔ لیکن مولوی کہتا ہے کہ نہیں تفکر و تعقل کا دور گزر چکا اور اب ہمارے لئے چارۂ کار سوائے اس کے کچھ نہیں کہ جو کچھ ہمارے اسلاف لکھ گئے ہیں اُن پر آنکھ بند کرکے ایمان لے آیا جائے

اس تعلیم نے یہ نقصان پہونچایا کہ مسلمانوں میں ذہنی غلامی پوری طرح سرایت کرگئی اور وہ اس دورِ علم و حکمت میں ناکارہ محض ہو کر رہ گئے

مولانا اسلم ملک کے اُن چند روشن خیال مولویوں میں سے ہیں، جو کورانہ تقلید کے مخالف ہیں اور قرآن میں غور و فکر کرنا ہر شخص کا فطری حق خیال کرتے ہیں،

اور اسی کو پیش نظر رکھ کر انھوں نے یہ کتاب مرتب کی ہے۔ اس جلد میں اللہ اور اس کے صفات، مخلوق، دین، رسالت، کتاب، اور معاد کے متعلق جو کھُلی ہوئی آیات قرآن میں پائی جاتی ہیں ان کو یکجا

کر دیا ہے اور اس اسلوب سے بجا کیا ہے کہ ایک آیت خود دوسری آیت کی تفسیر کرتی ہے

ہر چند اعظم گڈھ کا قدامت پرست شبلی اسکول جس کی " سیرۃ نبوی " پر مولانا اسلم نے آزادانہ تنقید کر کے اس کے نقائص ظاہر کئے ہیں، اور مولویوں کی دوسری جماعتیں جو اسی کور ذہنیت کی مالک ہیں، مولانا کے اس اقدام کو پسند نہ کریں گی اور ممکن ہے کہ وہ اس کے خلاف کافی پروپاگنڈا کریں لیکن مولانا اسلم باور کریں کہ اُن کی اس خدمت کی قدر کرنے والے اب مُلک میں کافی پیدا ہو گئے ہیں اور انھیں اس تالیف کے دوسرے حصّوں کو بھی جلد از جلد مکمل کر دینا چاہئے

مہ نور می فشاند و سگ بانگ می زند

یہ کتاب نہایت اچھی طباعت و کتابت کے ساتھ ۲۲۸ صفحات پر شایع ہوئی ہے اور مولانا سے جامعہ ملیہ قرول باغ دہلی کے پتہ پر دو روپیہ میں مل سکتی ہے

جنسی امراض اور ان کا علاج

یہ کتاب ڈاکٹر کرنل بھولا ناتھ آئی۔ ایم۔ اس۔ نے لکھی ہے اور تین حصّوں پر منقسم ہے۔ پہلا حصّہ تعلقات جنسی اور امراض و علاج سے متعلق ہے جسے خود کرنل صاحب نے لکھا ہے۔ دوسرا حصّہ حکیم مظفر حسین صاحب کا مرتب کیا ہے اور اس میں ویدک و یونانی نسخے درج کئے گئے ہیں۔ تیسرا حصّہ۔ برتھ کنٹرول کے لئے وقف ہے۔ کتاب بہ حیثیت مجموعی مفید ہے اور بہت ایسی معلومات کی حامل ہے جن سے ہر شخص کو واقف ہونا چاہئے

اس دَور میں دیگر علوم و فنون کے ساتھ ساتھ " جنسیات " پر بھی خاص توجہ کی جا رہی ہے اور کوشش ہو رہی ہے کہ اس فن کی معلومات عام کر دی جائیں۔ اس لئے مُلک کو کرنل صاحب کا ممنون ہونا چاہئے کہ انھوں نے اُردو میں اپنے تجربات کو قلمبند کر کے عوام کو اُن کے سمجھنے کا موقعہ دیا

ڈاکٹر محمد اشرف الحق صاحب کے رسایل کے بعد یہ دوسری مستحسن کوشش ہے۔ جس کی قدر مُلک کو کرنا چاہئے

یہ کتاب تین روپیہ (سے ر) میں کتب خانہ لطف زندگی اعوان منزل لاہور سے مل سکتی ہے

اصغر گونڈوی کی شاعری

اس کے مؤلف کوئی صاحب سرکوب الہ آبادی ہیں اس تالیف کا مقصود یہ ثابت کرنا ہے کہ اصغر مطلقاً شعر کہنا نہیں جانتے اور جب ان کو چیلنج دیا گیا کہ وہ کسی صحبت میں سب کے سامنے کسی طرح پر غزل کہیں، وہ جان بچا گئے

ہر چند اس کتاب میں اصغر صاحب کے خلاف و موافق دونوں مضامین جمع کئے گئے ہیں۔ لیکن مؤلف نے نتیجہ یہی نکالا ہے کہ وہ فن شعر سے بالکل نابلد ہیں

اس نوع کی تالیفات میرے نزدیک سنجیدہ طبائع کو متاثر کرنے میں کبھی کامیاب نہیں ہو سکتیں، کیونکہ ان کا تعلق یکسر ذاتیات سے ہوتا ہے اور دیکھنے والا بہ اوّل نظر خراب رائے قائم کرنے پر مجبور ہوتا ہے

محض یہ امر کہ اصغر صاحب نے چیلنج کو قبول نہیں کیا، اس امر کا ثبوت نہیں کہ وہ شعر نہیں کہہ سکتے، اور ہر سنجیدہ شخص کو وہی طرزِ عمل اختیار کرنا چاہیئے تھا جو اصغر صاحب نے اختیار کیا۔ اگر اس کے بجائے اصغر کی شاعری پر تبصرہ کرکے اس کے نقائص کو ظاہر کیا جاتا۔ تو بھی خیر کوئی بات ہوتی، گو ایسی اہم وہ بھی نہیں ——— معلوم نہیں اصغر صاحب اپنے شاعر ہونے پر فخر کرتے ہیں یا نہیں، لیکن میرے نزدیک ایک انسان کو سب سے پہلے اپنے انسان ہونے پر فخر کرنا چاہیئے

اگر اصغر صاحب اپنے اخلاق کے لحاظ سے صرف انسان ہیں اور شاعر نہیں تو بھی ان کے لئے یہی بس ہے اور شاعر نہ ہونا اُن کی عظمت کو کم نہیں کر سکتا

مجھے یہ کتاب دیکھ کر تکلیف ہوئی اور میں سرکوب صاحب کو مشورہ دوں گا کہ وہ آیندہ ایسی کوشش سے باز رہیں کیونکہ اصغر کو غیر شاعر ثابت کرنے کے سلسلہ میں اپنے حُسنِ اخلاق کا جو نمونہ وہ پیش کر رہے ہیں، وہ حد درجہ قابل نفرت ہے

یہ کتاب ۸ ریس مہدی علی خاں بک سیلر چوک الہ آباد سے مل سکتی ہے

بہار کی بھکارن

جناب سید فرید جعفری مچھلی شہری کا دوسرا افسانہ ہے جو علیحدہ رسالہ کی صورت میں شایع ہوا ہے۔ اس کہانی کا مقصود زلزلۂ بہار کی تباہیوں کے متعلق لوگوں میں جذبۂ ہمدردی پیدا کرنا ہے

فرید صاحب نے جس مقصد کے ساتھ یہ تصنیف پیش کی ہے وہ ہر آئینہ قابل قدر ہے اور چونکہ اس کی آمدنی زلزلہ فنڈ میں جائے گی اس لئے لوگوں کو قدر کرنی چاہیئے۔ قیمت درج نہیں ہے

ملنے کا پتہ سکرٹری بہار سنٹرل ریلیف کمیٹی پٹنہ ہے

رسالۂ معلومات

"افادیت" میں تجارت یقیناً شامل ہے، لیکن صرف تجارت تو افادیت کا مقصود واحد نہیں ———

اس نظریہ کو سامنے رکھ کر مُلک کے موجودہ رسایل وجرائد پر نگاہ ڈالئے، اور فیصلہ کیجئے کہ ان سے انسانی زندگی کا کون سا مفاد متعلق ہے۔ یعنی کیا تجارت کے علاوہ کوئی اور مقصد ان کے سامنے ہے ——— پھر تجارت تجارت میں بھی فرق ہے۔ امریکن وانگریزی مصنوعات کی مانگ چاہے کتنی ہی کم ہو۔ لیکن ان کی مضبوطی کا اعتراف ہر شخص کو کرنا پڑے گا۔ برخلاف اس کے کہ جاپان کا نام آتے ہی جنس کے ناکارہ، و نامضبوط ہونے کی

طرف خود بہ خود خیال منتقل ہو جاتا ہے

بالکل یہی کیفیت ہمارے ملک کے رسایل کی ہے کہ وہ تجارت بھی کرتے ہیں تو بالکل جاپانی قسم کی کہ چیز بظاہر نہایت خوشنما و ارزاں ہے، لیکن اگر نقش و نگار مٹا دیجئے تو اندر سوائے ردّی کاغذ اور بوسیدہ لکڑی کے اور کچھ ہاتھ نہ آئے گا

یہ وبا اوّل اوّل پنجاب سے شروع ہوئی۔ اور اب تمام ہندوستان اس میں مبتلا نظر آتا ہے ——

آپ کسی رسالہ کو اٹھا کر دیکھئے سرورق نہایت خوشنما و رنگین ہوگا، تصویروں کی بھرمار ہوگی۔ غزلیں بھی ہوں گی، فسانے و ڈرامے بھی نظر آئیں گے، ہنسنے ہنسانے والے مضامین بھی ہوں گے، لیکن آپ یہ چاہیں کہ ان کے مطالعہ کے بعد آپ کی معلومات میں کوئی اضافہ ہو یا کسی ذہنی و دماغی ترقی کی طرف خیال مایل ہو، تو آپ کو سخت مایوس ہونا پڑے گا

معارف اور سچ وغیرہ قدامت پرست مذہبی رسایل کا ذکر نہیں کہ وہ تو کولھو کا بیل ہیں۔ جن کے لئے آنکھ پر پٹی باندھ کر ایک ہی حلقہ میں چکر لگانا مقسوم ہو چکا ہے اس طرح نہ اُن رسائل کا ذکر ہے جو مذہب کے پردہ میں لغو و مہمل کتابوں کی تجارت کرنا چاہتے ہیں اور جو آپ کے دماغ کو سال بھر تک۔ ادنیٰ قسم کا مذہبی لٹریچر سے تباہ کرنے کا معاوضہ بارہ آنے ایک روپیہ سے زیادہ نہیں لیتے، بلکہ افسوس تو اُن لوگوں پر ہے جو اپنے آپ کو روشن خیال و روشن دماغ کہتے ہیں اور پھر بھی اُن کے سامنے افادیت کا مفہوم ارزاں تجارت کے علاوہ کچھ نہیں ——

پنجاب میں اس وقت بعض رسایل ایک خاص مرتبہ و امتیاز کے مالک سمجھے جاتے ہیں۔ لیکن میں دیکھتا ہوں کہ ان کا عنصر غالب بھی افسانوں اور غزلوں کے سوا کچھ نہیں ہوتا، درانحالیکہ ان کے مالک ایسے ہیں جن کو کوئی مادّی فائدہ اٹھانا مقصود نہیں ہے۔ اور اگر وہ چاہتے تو اپنے رسائل کو اقتصاد و سیاست اور معیشت و معاشرت کے اُن مسایل کے لئے وقف کر سکتے ہیں جن کی تعلیم و اشاعت کی اس وقت سخت ضرورت ہے۔ البتہ اگر دہلی پنجاب میں شامل سمجھا جائے تو رسالۂ جامعہ کو مستثنیٰ سمجھنا پڑے گا، جو واقعی صحیح معنے میں ملک و قوم کی برمحل خدمت انجام دے رہا ہے

یو۔ پی کے رسایل اس سے زیادہ بدبختی میں مبتلا ہیں کہ اُن کو تجارت کا بھی سلیقہ نہیں اور گجن و زبیدہ کی تصویریں شایع کرنے کے بعد بھی خریداروں میں اضافہ نہیں کر سکتے۔ پھر اس کا سبب یہ نہیں کہ مفید چیز کی مانگ نہیں ہے بلکہ وجہ صرف یہ ہے کہ پہلے رسایل کی ترتیب پڑھے لکھے لوگوں کے ہاتھ میں تھی اور اب ہر وہ شخص جو ایک بورڈ کی قیمت ادا کر سکتا ہے اڈیٹر بنا ہوا ہے

البتہ اب سے ۸ سال قبل ہیں لکھنؤ سے اور رسالے صبح اُمید اور معلومات ایسے جاری تھے جو واقعی مفید تھے۔ صبح امید کے احیاء کی تو کوئی توقع نہیں، لیکن معلومات پھر جاری ہوا ہے

اس کے اڈیٹر مسٹر عبد الوالی۔ بی۔ اے نہایت روشن خیال اور وسیع المطالعہ انسان ہیں اور اچھی طرح سمجھتے ہیں کہ ملک و قوم کے سامنے کس قسم کا لٹریچر پیش کرنے کی ضرورت ہے، چنانچہ مارچ و اپریل کے رسالوں میں انھوں نے بعض بین الاقوامی مسایل پر نہایت مفید و جامع مضامین لکھے ہیں اور ایسی صاف و شگفتہ زبان میں کہ پڑھنے والے کے دماغ پر کوئی بار نہیں ہوتا

ہر چند افراد قوم جو ادنیٰ درجہ کا ارزاں لٹریچر اور صرف نقش و رنگ دیکھنے کے عادی ہو گئے ہیں اس طرف جلد متوجہ نہ ہوں گے۔ لیکن عبد الوالی صاحب کو مطمئن رہنا چاہئے ایک وقت آئے گا جب ان کے مساعی کی قدر کی جائے گی۔ اور اگر یہ نہ ہو تو بھی ان کے اطمینان ضمیر کے لئے یہ کیا کم ہے کہ انھوں نے پبلک کے ذوق کو خراب کرنے میں کوئی حصہ نہیں لیا

شہوانیات یا ترغیبات جنسی

حضرت نیاز کے قلم سے

جس میں فحاشی کی تمام فطری و غیر فطری قسموں کے حالات اور اُن کی تاریخی و نفسیاتی اہمیت پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے اس میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ مذاہب عالم نے اس کے رواج میں کتنی مدد کی اور آیندہ اخلاق انسانی کی بنیاد کن اصول پر قایم ہونا ہے۔ الغرض اپنی نوعیت کے لحاظ سے یہ کتاب بالکل نئی چیز ہے اور ایک بار شروع کرنے کے بعد بغیر ختم کئے ہوئے آپ اسے چھوڑ نہیں سکتے۔ اس کتاب میں ایسے ایسے حیرت انگیز واقعات درج ہیں کہ آپ نے کبھی سنے نہ ہوں گے۔ اگر آپ نگار کے خریدار ہیں تو علاوہ محصول ۸ر کے مجلد کتاب صرف ۱۲ر میں۔ اور غیر مجلد ۸ر میں ملے گی اور اگر آپ نگار کے خریدار نہیں ہیں تو مجلد ۱۲ر میں اور غیر مجلد ۱۰ر میں علاوہ محصول ۸ر کے ملے گی

اگر

ارشاد ہو تو کتاب ذریعۂ وی۔ پی روانہ کی جائے حجم ۲۰۵ صفحات۔ آرڈر میں مجلد و غیر مجلد کی صراحت ضروری ہے ——————

منیجر نگار لکھنؤ

باب المراسلۃ والمناظرۃ

دعوائے مہدویت

(جناب سید محمد مہدی صاحب - الہ آباد)

میں شروع سے نگار کا مطالعہ کر رہا ہوں اور جو تدریجی انقلاب آپ کے خیالات میں ہوا ہے وہ پوری تفصیل کے ساتھ میرے سامنے ہے۔ پھر اس دوران میں کئی بار آپ کی تحریر نے وہ رنگ اختیار کیا کہ اس کے بعد سوائے اعلانِ مہدویت کے کسی اور منزل کی گنجایش نہ تھی لیکن افسوس ہے کہ میرا یہ خیال غلط نکلا اور آپ پھر ٹال گئے

دو تین سال ہوئے جو ہنگامہ کفر و الحاد کا آپ کے خلاف ہوا تھا، اس کو دیکھتے ہوئے میں نے خیال کیا تھا کہ شاید نگار کی روش بدل جائے گی اور اس طرح میری وہ تمام توقعات ختم ہو جائیں گی جو آپ کی طرف سے میں نے قایم کی تھیں، لیکن میں دیکھتا ہوں کہ نگار کا مشن بدستور وہی قائم ہے بلکہ سچ پوچھئے تو اس ہنگامہ کے بعد آپ نے جو مضامین لکھے ہیں وہ بہت زیادہ سخت ہیں اور مذہب پر نہایت کاری ضرب لگانے والے ہیں۔ اس لیے صورتیں تمام وہی موجود ہیں اور کوئی وجہ نہیں کہ پنجاب تو اتنے متعدد نبی اس وقت تک پیش کر چکے۔ اور ہمارا یو۔پی ایک مہدی آخر الزماں بھی نہ پیدا کر سکے۔ یہ بھی کر دیکھئے، شاید کوئی صورت فلاح و اصلاح کی پیدا ہو سکے

(نگار) آپ کے مشورہ کا شکریہ، لیکن میرے محترم دوست، شاید آپکو معلوم نہیں کہ جو آپ کا منتہائے نظر و خیال ہے، وہ میری پرواز کے لحاظ سے ننگِ پر و بال ہے، آپ کے نزدیک مہدی ہو جانا گویا اتنی بڑی بات ہے کہ اس کے لئے کوئی خاص دعوے و اہتمام درکار ہوتا ہے۔ اور اگر آپ کسی پر طعن کرنا چاہیں تو یہ نام لیکر اس خواہش کو پورا کر سکتے ہیں۔ کاش آپ سمجھ سکتے

کہ انسان مہدی و نبی سے بھی گزر کر خدا بننے کے لئے عالم وجود میں آیا ہے اور اگر آپ مجھے مشورہ دینے پر مجبور ہی تھے تو میرے دستِ گستاخ کو دامنِ الوہیت کی طرف بڑھنے کی دعوت دیتے، عرش و کرسی پر چھا جانے کا ایما فرماتے نہ کہ دعوائے مہدویت جو میرے حوصلہ و عزم کے لحاظ سے کہیں فروتر ہے

مجھے نہیں معلوم کہ آپ دجال و مہدی وغیرہ کے ظہور کے قایل ہیں یا نہیں، لیکن اگر آپ آل رسول ہونے کے لحاظ سے واقعی "امام مخفی" کی آمد کے منتظر ہیں تو کیا دیر ہے

بال بکشا دصفیر از شجر طوبےٰ زن

آئیے، اور اس دلِ خانہ خراب کے حلقۂ ارادت میں شامل ہو جائیے - آپ کی توقعات تو کسی طرح پوری ہوں "امام منتظر" کے لئے آپ کی یہ اختر شماریاں تو کسی طرح ختم ہونے میں آئیں

میرے عزیز دوست، باور کیجئے کہ آپ حضرات، اخلاق کی جس منزل سے گزر رہے ہیں، وہ میرے نزدیک خدا اور مذہب دونوں کے لئے باعثِ توہین ہے ——اگر خدا اتنی مدت کے بعد بھی انسان بنانے میں کامیاب نہیں اور اس کا بتایا ہوا مذہب ہزاروں سال کی عمر پانے کے بعد بھی ہنوز تکمیل انسانیت کی راہیں متعین نہیں کر سکا تو ایسے خدا و مذہب کو لے کر ہم کیا کریں——

کتنا اندھیر ہے کہ آپ اس روشن زمانہ میں بھی خدا اور نبی کی جستجو میں لگے ہوئے ہیں اور خود اپنی جستجو کی طرف سے غافل ہیں

سر روحانیاں داری ولے خود را ندیدستی
بہ خواب خود در آتا قبلۂ روحانیاں بینی

دار المصنفین اور سیرۃ نبوی

(جناب عبدالحمید صاحب - حیدر آباد)

کسی گزشتہ پرچے میں آپ نے دار المصنفین سیرت نبوی پر تنقید کی تھی میں نے اس کتاب کو منگا کر دیکھا تو آپ کی باتوں کی حرف بحرف تصدیق کرنی پڑی - قرآن تو کہتا ہے قل انما انا بشر مثلکم اور در حقیقت رسول اکرم کی عظمت کا راز بھی خالص بشریت ہے اور اسی قرآنی تعلیم نے مسلمانوں کو صحیح راستے پر قائم رکھا کہ انھوں نے اپنے اتنے بڑے رسول کو عیسائیوں کی طرح خدا نہیں بنایا لیکن یہ سیرت

ان کو خدا بنانا چاہتی ہے اس کی چوتھی جلد کے صفحہ ۸۰ میں ہے کہ رسول اللہ ما فوق البشر ہیں۔ قرآن کہتا ہے کہ قل لا اقول لکم انی ملک۔ پھر جب ما فوق البشر ہیں اور فرشتہ ہونے سے انکار ہے تو سوائے الوہیت کے اور کیا صورت ہوگی۔ اس کے مؤلف کی قرآن دانی کا یہ حال ہے کہ اس میں صفحہ ۲۵ میں آیت ولا یشفعون الا لمن ارتضیٰ کو جو ملائکہ کے متعلق ہے انبیاء کے شان میں قرار دیا ہے صفحہ ۱۳۰ میں آیت وما انزلنا علی قومہ من بعدہ من جند من السماء کا عجیب ترجمہ لکھا ہے کہ ہم نے اس کے مرنے کے بعد اس پیغام کو دے کر اس کی قوم پر آسمان سے کوئی فوج نہیں اتاری وہ سمجھتا ہے کہ فوجوں کا کام پیغام لے کر جانا ہے۔ غرض اسی قسم کی قرآن سے ناواقفیت بلکہ عمیق جہالت اس کتاب میں نظر آتی ہے آپ حسب ذیل امور کا جواب ضرور لکھیں

(۱) دار المصنفین کا مالک کون ہے

(۲) اس میں کون کون لوگ کام کرتے ہیں اور ان کی علمی قابلیتیں کیا کیا ہیں

(۳) اس کو کن کن ریاستوں سے کتنی کتنی امداد ملتی ہے اور آج تک پبلک سے کس قدر چندہ لیا

(۴) کیا آپ کے خیال میں یہ جماعت کتابوں کی تجارتی کمپنی سے کچھ زیادہ حیثیت رکھتی ہے

(۵) یہ جماعت قدیم الخیال مولویوں کی نمایندہ ہے پھر اس کو کیا ترجیح دیوبند یا دیگر مدارس کے علماء پر حاصل ہے جس کی وجہ سے یہ امداد کی مستحق ہے اور اس کے پاس وہ کیا چیز ہے جو مسلمانوں کے سامنے پیش کرنا ضروری ہے

(نگار) آپ نے جس نوع کے اسقام و اغلاط کا ذکر کیا ہے اُن کی سیرۃ نبوی میں کمی نہیں آپ یا کوئی کہاں تک ڈھونڈھے گا۔ اور کب تک سر پیٹے گا —— افسوس ہے کہ تاریخ اسلام میں یہی ایک چیز ایسی تھی جو دنیا کے سامنے پیش کرنے کی تھی۔ لیکن مولویوں نے اس کو بھی اس قابل نہ رکھا کہ خود اپنے ہی لوگ دیکھ سکیں، چہ جائیکہ اغیار!

سچ تو یہ ہے کہ دار المصنفین کی سیرۃ نبوی سے بدرجہا بہتر بعض مستشرقین مغرب کی وہ تصانیف ہیں۔ جن میں کم از کم دس جگہ تو عقل و انصاف سے کام لیا گیا ہے، یہاں تو شروع ہی سے اس کا التزام رکھا گیا ہے کہ سوائے مسلمان کے کوئی اور اسے پڑھ نہ سکے۔ اور اگر پڑھے تو محمدؐ کو دیوتا یا علم الاصنام کا کوئی کیرکٹر سمجھ کر خاموش ہو جائے —— پھر تماشہ یہ ہے کہ اس غلو کا نام محبت رسول رکھا جاتا ہے، سچ کہا ہے کسی نے کہ خدا مجھے میرے دوستوں سے بچائے

آپ نے جو اور سوالات کئے ہیں۔ ان کا جواب آپ براہ راست دار المصنفین ہی سے طلب فرمائیں تو بہتر ہے

باب الاستفسار

کوثر

(جناب لطف الٰہی صاحب - بنگلور)

قرآن میں لفظ کوثر سے کیا مراد ہے کیا واقعی وہ کوئی حوض یا چشمہ ہے جو جنت میں پایا جاتا ہے اور مسلمانوں کے لئے مخصوص ہے

(نگار) لفظ کوثر کلام مجید میں صرف ایک جگہ آیا ہے :-

اِنا اعطیناک الکوثر یہاں لفظ کوثر بروزن "فوعل" "کثر" سے مشتق ہے اور خیر کثیر کے معنی میں آیا ہے، یعنی ہم نے تجکو بہت سے برکات بخشے ہیں۔ لیکن افسوس ہے کہ عام مفسرین نے اس حقیقی معنی کی طرف بالکل اعتنا نہیں کیا اور احادیث پر اعتماد کر کے کسی جگہ یہ ظاہر کیا گیا ہے۔ کہ کوثر ایک نہر ہے فردوس کی اور کہیں یہ کہ رسول اللہ نے فرمایا کہ وہ پانی کا حوض ہے جو میرے لئے مخصوص ہے اور جو معراج کے وقت مجھکو دکھایا گیا

مکی سورتوں میں فردوس کی نہروں کا ذکر اجمال کے ساتھ اور مدنی سورتوں میں زیادہ تفصیل کے ساتھ پایا جاتا ہے :-

مثل الجنتہ اللتی وعد المتقون - فیھا انھار من ماء غیر آسن وانھار من لبن لم یتغیر طعمہ وانھار من خمر لذۃ للشاربین وانھار من عسل مصفی

یعنی ان میں پانی، دودھ، شراب اور شہد کی نہروں کا ہونا ظاہر کیا گیا ہے —— عیسائی اور یہودی روایات میں بھی جنت کی نہروں کا ذکر پایا جاتا ہے اور سوائے اس کے کوئی فرق نہیں کہ وہاں دودھ اور شہد کے علاوہ تیل کی نہر کا بھی ذکر ہے اور مسلمانوں میں تیل کے بجائے پانی ہے

رسول اللہ کی حیات میں تو لفظ کوثر خیر کثیر ہی کے مفہوم میں لیا جاتا تھا لیکن آپ کے بعد وہ چشمۂ فردوس بن کر رہ گیا اور بقول طبری اس کا پانی برف سے زیادہ سفید اور شہد سے زیادہ شیریں ہے ——— پھر یہ بدعت اسی جگہ ختم نہیں ہو گئی بلکہ اس میں شاعرانہ مبالغہ سے کام لے کر یہ بھی بتایا گیا کہ اس نہر کے ساحل سونے کے ہیں اور اس کی تہ میں موتی اور لعل بچھے ہوئے ہیں ——— اسی کے ساتھ یہ جغرافی تحقیق بھی پیش کی گئی کہ جنت کی تمام نہریں اسی کوثر کے اندر آکر گرتی ہیں جس کا دوسرا نام "نہر محمد" بھی ہے

قرآن میں جابجا فردوس کی عشرتوں اور جہنم کے مصائب کا ذکر پایا جاتا ہے۔ اور یقیناً وہ سب بیان تشبیہی و تمثیلی ہے جس کو مادی صورت سے کوئی واسطہ نہیں، لیکن ہمارے مفسرین نے جنکے لئے موضوع احادیث کی کوئی کمی نہ تھی ان تمام باتوں کو دنیاوی لذت والم کا مفہوم سامنے رکھ کر پیش کیا اور اس طرح ایک بڑا دفتر "جنّیات" کا مرتب ہو گیا ——— انھوں نے ایسا کیوں کیا۔ اس کے دو ہی سبب ہو سکتے ہیں، یا تو وہ خود حقیقتاً ان تمام باتوں کو صحیح باور کرتے تھے یا یہ کہ صرف بربنائے مصلحت عوام کو ایسا سمجھاتے تھے تاکہ ان میں رغبت و شوق پیدا ہو مجھے اس کے ماننے میں تامل ہے کہ مقصود صرف ترغیب و تشویق تھی بلکہ وہ حقیقتاً جنت و دوزخ کو اسی مفہوم و معنی میں لیتے تھے جو یہود و نصاریٰ یا قدیم ایرانی روایات میں پایا جاتا ہے اور چونکہ اسرائیلی حکایات بیان کرنے کی ممانعت نہ تھی اس لئے رفتہ رفتہ تمام وہ قصے کہانیاں جو اُس وقت رائج تھیں اور جن کو وہ لوگ اکثر سنتے رہتے تھے، اسلام میں شامل کر دی گئیں اور موضوع احادیث کے ذریعہ سے ان کی توثیق بھی ہوتی رہی تاکہ لوگوں کو چون وچرا کا موقعہ نہ ملے

قرآن مجید میں دوزخ و جنت کے حقیقی مفہوم کو بھی جابجا ظاہر کیا گیا ہے۔ یعنی نہایت صاف الفاظ میں ان کو غیر مادی ظاہر کرتے ہوئے ان کا مفہوم قوم کا زوال وعروج بتایا گیا ہے، لیکن افسوس ہے کہ کلام مجید کو احادیث سے علٰحدہ کر کے کبھی سامنے پیش نہیں کیا گیا۔ اور روایات موضوعہ سے ہٹ کر کبھی اس کا مطالعہ نہیں کیا گیا ورنہ یہ حقیقت واضح ہو سکتی

پھر تماشہ یہ ہے کہ یہ واہمہ پرستیاں کسی خاص زمانہ سے مخصوص نہ تھیں بلکہ تقریباً ہر دور میں پائی جاتی تھیں اور رفتہ رفتہ برابر ان میں اضافہ ہوتا رہا۔ یہاں تک کہ خرافیات کا ایک انبار ہو گیا اور اسلام اس کے اندر ہمیشہ کے لئے دفن کر دیا گیا

اس سے قبل نگار کے صفحات میں دوزخ و جنت کے حقیقی مفہوم پر کافی بحث کر چکا ہوں اس لئے اعادہ و تکرار کی ضرورت نہیں اسے ملاحظہ فرمائیے

اگر آپ چاہتے ہیں

کہ آپ کی فرمائش کی تعمیل فوراً کر دی جائے تو نمبر خریداری ضرور لکھئے ——— مینیجر نگار

لکھنؤ کی شاعری

اے زبانِ لکھنؤ، اے لکھنؤ کی شاعری
اے سراپا تیرا آورد، اے تکلف کی پری

اے تصنع پر فدا، اے صنعتوں کی تاجدار
باغ آب و رنگ میں کاغذ کے پھولوں کی بہار

کچھ تجھے معلوم ہے تونے لیا کیونکر جنم
کچھ تجھے معلوم ہے تجھ میں ہوا کیا بیش و کم

یعنی دلی جب جمالِ شعر کی دیوانہ تھی
شاعری سے سرزمینِ لکھنؤ بیگانہ تھی

میں نہیں کہتا کہ اس جا کوئی آبادی نہ تھی
میں نہیں کہتا یہاں دریا نہ تھا، وادی نہ تھی

میں نہیں کہتا کہ اس جا صاحبِ دولت نہ تھے
میں نہیں کہتا کہ اس جا صاحبِ حشمت نہ تھے

میں نہیں کہتا کہ انساں اس جگہ ملتے نہ تھے
میں نہیں کہتا گل و غنچہ یہاں کھلتے نہ تھے

مالکِ سیف و قلم تھے صاحبِ ایجاد تھے
دلبرانِ خوش ادا تھے عاشقِ ناشاد تھے

تھی یہی خاکی زمیں، اور تھا یہی چرخ کبود
ہاں نہیں تھا، تو نہیں تھا شعر کا اس میں وجود

رمز دانانِ تخیل اس جگہ ملتے نہ تھے،
شعر کی تاثیر سے دل اس جگہ ہلتے نہ تھے

ناگہاں اتنے میں بدلا رنگ فیض آباد کا
لکھنؤ مسکن ہوا ہر صاحبِ ایجاد کا

اس طرف دلی کی قسمت میں ہوا اک انقلاب
یعنی وہ ہنگامۂ عشرت ہوا ماضی کا خواب

ٹھوکریں کھاتے ہوئے پھرنے لگے اہلِ ہنر
گھر سے نکلے، شہر چھوڑا، خاک اڑائی در بدر

بینوا کچھ آ گئے اس جانب گدائی کے لئے
امن کے جویا تھے دفعِ بینوائی کے لئے

میرزا سودا بھی تھے ان بیکسوں میں میر بھی
جرأت و انشا بھی تھے اور سوز بھی اور مصحفی

اپنے اپنے رنگ میں کی شعر خوانی اس طرح
طائرانِ خوش نوا گلشن میں چہکیں جس طرح

جب بیاں کرتے تھے وہ فرقت کے حالاتِ یوں
آتے تھے بیساختہ آنکھوں سے اشکِ خوں

جب وہ کہتے تھے کہ ہم نے یوں گزاری زندگی
بنتی تھی فوراً شبیہِ بے قراری، زندگی

گوشہ گوشہ ہو رہا تھا مستِ صہبائے سخن
بچہ بچہ بن گیا تھا بادہ پیمائے سخن،،

میر کی تخئیل نے دنیا کو حیراں کر دیا،
سوز نے اک جوشش دنیا میں نمایاں کر دیا

مصحفی نے سیکھنے والوں کو جو تعلیم دی
شعر خوانانِ ادب نے شوق سے تسلیم کی"

وہ ضمیر خوش بیاں، وہ آتشِ رنگیں نوا
وہ اسیر نکتہ داں، وہ غافلِ معنی سرا

ایک پر کیا ایسے ایسے سیکڑوں دیوانے تھے
شمع گو تھی ایک، لیکن ہر طرف پروانے تھے"

ایک اس کامل نے دنیا بھر کو کامل کر دیا،
حلقۂ درس و ادب میں سب کو شامل کر دیا

دینِ شعر و شاعری یکسر مکمل ہو گیا،
لکھنؤ جو کچھ نہ تھا دلی سے افضل ہو گیا

دورِ نیرنگِ فلک نے اک نیا دکھلا دیا
شاعروں میں یعنی اک ناسخ کو بھی پیدا کیا

کون ناسخ جس نے کر دی شاعری یکسر تباہ
شعر کا دفتر کا دفتر کر دیا جس نے سیاہ

کون ناسخ جس کی ہے الفاظ پر نام و نمود
کون ناسخ ہے تصنع جس کا سازِ ہست و بود

جس نے لفظوں سے بنایا اک گھروندا شعر کا
جس نے پائے خامہ سے میدان روندا شعر کا

جس نے ایہام و تناسب کو بنایا راہ بر،
جس نے تضییعِ ہنر کا نام رکھا تھا ہنر،

جس کو آتا ہی نہ تھا ہرگز تناقر کا خیال
تھا نمایاں جس کے شعروں میں سراسر ابتذال

چغد کی آواز کو سمجھا جو آوازِ ہزار،
جس کا مرغِ دل تھا دروازے کی بلی کا شکار

ماتھ بگڑا شاعری کا اس کی سعیٔ تام سے
نفرت آئی اہلِ دل کو شاعری کے نام سے

ہو گیا آخر اسی اک رنگ پر جب اجتماع
آتش اور آتش کے شاگردوں نے بھی کی اتباع

انتہا یہ ہے کہ پیرو ہو گئے اس کے انیس
جیسے وہ تھے ہو گئے ویسے ہی بھران کے جلیس

وہ انیسِ خوش بیاں جن کا جہاں میں نام ہے
شاعری جنکی جہاں کے واسطے پیغام ہے

شاعری سے گو نہیں تھا ان کو کوئی واسطہ
کیونکہ داخل شعر میں ہرگز نہیں ہیں مرثیہ

اس میں جو آہ و بکا ہے شعر میں داخل نہیں
شعر ہے ظاہر میں لیکن شعر میں شامل نہیں

اور اگر ہم مان لیں اس کو کہ ہو وہ شاعری
پھر بھی وہ رنگِ تغزل کی نہیں جلوہ گری

یہ مناظر صبح کے، یہ شامِ رنگیں کا بیاں
اور یہ گھوڑے کی روانی صورتِ برقِ تپاں

تیزیٔ شمشیرِ براں، صورتِ جوشِ وغا
ہونے کو سب کچھ ہیں، لیکن ہیں تغزل سے جدا

وہ تعشق، وہ صبا، وہ رند، وہ خوش گو امیر
سب کے سب تھے ایک ہی دامِ تعلق میں اسیر

شعر کہنے کو تو لاکھوں ہیں مگر کچھ بھی نہیں
نالۂ بیکار لاکھوں ہیں اثر کچھ بھی نہیں

ایک کے ہاتھوں سے ہے دامانِ سنبل تار تار
ایک کمسن قاتلوں میں ہو گیا جا کر شکار

ایک نے نوچا جنوں میں جا کے دامانِ سحر
ایک تربت پر ہوا مجنوں کی جا کر نوحہ گر

ایک نے ڈھونڈی کمر لیکن کہیں پائی نہیں
ایک مفلس ہو گیا ہے گھر میں اک پائی نہیں

ایک کے ہاتھوں سے چھوٹا توسنِ عمر رواں
دوسرے نے نقدِ جاں دے کر کیا سوداگراں

ایک نے دشتِ جنوں میں خاک اڑائی عمر بھر
ایک نے سیلابِ گریہ سے بہایا اپنا گھر

قصہ کوتہ رنگ دنیا بھر کا یکساں ہی رہا
شعر کا دفتر پریشاں تھا پریشاں ہی رہا

رفتہ رفتہ آ گیا دنیا میں پھر دورِ صفیؔ
اُن کی شہرت مٹ گئی اور ان کی اب شہرت ہوئی

تھے معاصر انکے مرزا ثاقبؔ و آبرؔ و بہارؔ
فاضل و ثروت، عزیزؔ نکتہ دانِ نامدار

باہمی کرتے تھے مل مل کر یہ ایجادِ سخن
محفلوں میں شعر کی دیتے رہے دادِ سخن

اوّل اوّل ان کا بھی لیکن قدیمی رنگ تھا
لکھنؤ کا بچہ بچہ جس کے اوپر دنگ تھا

نکتہ دانوں کے لئے وہ ایک سیدھی راہ تھی
جس میں کچھ کچھ آہ شامل اور کچھ کچھ واہ تھی

تھی وہی پھر مار دُور از عقل تشبیہات کی
تھی وہی گیسوئے جاناں میں سیاہی رات کی

تھا وہی بادام کی صورت میں آنکھوں کا ظہور،
تھا وہی عارض کی رنگینی میں پنہاں نورِ طور

رفتہ رفتہ جب خرابی اس کی دکھلائی گئی،
متفق ہو کر یہ اک تجویز ٹھہرائی گئی،

چاہئے اب منعقد کرنا ہمیں اک انجمن،
جس میں سب آ بس کے شامل ہو کے دیں دادِ سخن

اب قدیمی رنگ میں لازم ہے کچھ قطع و برید
اب پرانے غمزوں کے آخر رہیں کب تک شہید

رنگ ناسخؔ کا نہیں ہے آجکل کچھ دل نشیں
جو پرانے بت ہیں وہ قابل پرستش کے نہیں

جادۂ غالبؔ پہ رکھنا چاہیے، ہم کو قدم
اس سے ممکن ہے کہ پھر دنیا میں ہوں مشہور ہم

الغرض قائم ہوئی اس وقت بعدِ سعیِ تام
انجمن شعر و سخن کی جس کا تھا معیار نام

اک طرف ناطقؔ، صفیؔ، اور اک طرف محشرؔ عزیزؔ
اک طرف ابرؔ و بہارؔ و ثاقبؔ والا تمیز،

اسمیں ثروتؔ بھی تھے، عالمؔ بھی تھے اور فاضلؔ بھی تھے
ماسوا ان ہستیوں کے اور اہلِ دل بھی تھے

مل کے ان سب نے کیا تبدیل رنگِ شاعری
یعنی ٹھہری مرثیہ کے ساتھ جنگ شاعری

جب نہ ان سے ہو سکے مضمونِ غالبؔ سے بہم
آخرش سب نے اٹھایا مل کے نوحہ پر قلم

جانکنی کے سب کے سب ساماں بہم ہونے لگے
رفتہ رفتہ موت کے مضموں رقم ہونے لگے

ایک کی اینٹھی رگیں یعنی تشنج ہو گیا
ایک کا منہ بھر بھرایا اور تہیج ہو گیا

ایک کو رقابتِ اصغر کی شکایت ہو گئی
ایک روئے اسقدر شدت سے رقت ہو گئی
اُس نے گورستاں میں مردوں سے کیا جاکر کلام
موت کی ہچکی سے آیا دوست کا اس کو پیام
الغرض اس وقت سے یہ رنگ جاری ہو گیا
خون بن بن کر رگ و پے میں یہ ساری ہو گیا
آجتک سب اہل دل ہیں اس بلا میں مبتلا
شاعری کا واہ کیا اچھا ملا ان کو صلا
وہ سراج نکتہ داں، اور وہ قدیرؔ ذی ہنر
آرزوؔ و منظرؔ و آشفتہؔ، و الا گہر،
سب اسیرِ رنگ و بوئے باغِ پیشینہ ہوئے
سب قتیلِ خنجرِ معشوقِ دیرینہ ہوئے

آجتک ان کا وہی ہے تار و پود شاعری
شاعری کیوں کہئے اس کو بلکہ کہئے "ماعری"

ہوشؔ (ملیح آبادی)

صرف پچپن روپیہ

یا

پانچ روپیہ ماہوار

میرے والد کا حال ہی میں انتقال ہو گیا ہے اور میں مجبور ہوں کہ کسب معاش کے لئے خود ہاتھ پاؤں ہلاؤں ـــــ میں نے الہ آباد کے زنانہ نارمل اسکول میں داخلہ کا انتظام کر لیا ہے جس کا سشن یکم جولائی سے شروع ہوتا ہے اور گیارہ مہینے میں ختم ہو جاتا ہے

میں اپنے بے شمار بھائیوں اور بہنوں سے اپیل کرتی ہوں کہ یا تو گیارہ ماہ کے لئے یک مشت ۵۵ کی امداد فرمادیں یا پانچ روپیہ ماہوار کا وظیفہ مرحمت فرمادیں

میں وعدہ کرتی ہوں کہ ملازمت کے بعد جس کا ملنا یقینی ہے۔ بہت جلد اس رقم کو واپس کر دوں گی

الف۔ جیم۔ ذریعہ دفتر نگار۔ لکھنؤ

کلام اختر

ہیں وہی صبر آزمابے سروسامانیاں
مٹ نہ سکیں عمر بھر میری پریشانیاں

طائرِ مجروح ہوں، میرے لئے وقف ہیں
روح کی بیچینیاں، دل کی پرافشانیاں

نزع کی طاری ہے گو مستقل اک کیفیت
سانس نہیں ٹوٹتا، اُف رے گرانجانیاں

درد دوا ہوگیا عشق میں پایانِ کار
رازِ سکوں بن گئیں، غم کی فراوانیاں

میری نظر میں نہاں روح کی افسردگی
میری جبیں پر عیاں قلب کی ویرانیاں

کاش کبھی پاسکیں رازِ مۓ بیخودی
عقل کی بے راہیاں، ہوش کی نادانیاں

ڈوب چکی نبضِ دل، درد نہ کم ہوسکا
آج بھی اشکوں کی ہیں، ویسی ہی طغیانیاں

دل ہے ترا آئینہ، دل سے نگاہوں کو ربط
تیری تمنا کا راز ہیں مری حیرانیاں

اختر ناکام ہے اور وہی، ہمت شکن
درد کی جانکاہیاں، غم کی فراوانیاں

میری مشکل نہ ہوئی دہر میں آساں کوئی
نہ ملا آہ، مرے درد کا درماں کوئی

سوچتا ہوں کہ بایں غفلت و مجبوری و یاس
زندگی ہے مری یا خوابِ پریشاں کوئی

اور کس کام کے ہیں قطرۂ جگر کے ٹکڑے
زیبِ داماں ہو کوئی، زینتِ مژگاں کوئی

جان کیوں تن سے نکلتے ہوئے گھبراتی ہے
عیشِ سرمد تو نہیں، عمرِ گریزاں کوئی

لاکھ لبریزِ مۓ رنگ ہو مینائے بہار!
دل میں بجھتا ہے شرارِ غمِ پنہاں کوئی

ٹوٹتے ہیں کہیں بے مے بھی حجاباتِ نظر
مل چکا شیخ! تجھے رُتبۂ عرفاں کوئی

الاماں سوزِ محبت کہ یہ عالم کب تک!
جیسے ہو دل میں نہاں شعلۂ لرزاں کوئی

وقت پر آنہ سکے، اور جب آئے نہ رکے
زندگانی پہ نہیں موت کا احساں کوئی

میں رہا صرفِ شبِ وادیٔ وحشت اختر
میرے عالم میں نہ تھی صبحِ گلستاں کوئی

اختر (حیدرآباد دکن)

اشک بیتاب

جب پسِ کہسار چھپ جاتا ہے مہرِ تیز گام اور سنہری بال بکھرائے ہوئے آتی ہے شام
چھیڑتی ہے جب الم کے گیت جوئے خوشخرام آہ! ان محروم آنکھوں سے ٹپک جاتے ہیں اشک

جب سرورِ خواب میں مدہوش ہو جاتا ہے دہر جب ردائے سیم کے دامن میں سو جاتا ہے دہر
جب سکوت و خامشی کی لَے میں کھو جاتا ہے دہر آہ! ان محروم آنکھوں سے ٹپک جاتے ہیں اشک

چاندنی میں گونجتے ہیں جب حدی خوانوں کے گیت رات کے یا آخری حصے میں دہقانوں کے گیت
بیخودی میں جبکہ سنتا ہوں یہ دیوانوں کے گیت آہ! ان محروم آنکھوں سے ٹپک جاتے ہیں اشک

جب فضائے آسماں پر گھر کے آتے ہیں سحاب بجلیوں کی کوند میں ہوتا ہے بہم اضطراب
یاد آتے ہو مجھے تم اور وہ عہدِ شباب آہ! ان محروم آنکھوں سے ٹپک جاتے ہیں اشک

آم کا وہ پیڑ جو ہے برلبِ آبِ رواں بچپنے میں کھیلتے رہتے تھے پہروں تک جہاں
رات کو جب چاندنی میں جا نکلتا ہوں وہاں آہ! ان محروم آنکھوں سے ٹپک جاتے ہیں اشک

شیدا

صدائے دل

مآلِ عشق کی ناکامیوں میں محو ہوں گم ہوں　　کہ میں سازِ شکستِ آرزو کا اک ترنم ہوں

مجھے اب قید و بندِ زندگی سے واسطہ کیا ہو
ہوئی مدت کہ اپنی روح سے محوِ تکلم ہوں

حجابِ تیرگی کچھ اس طرح اٹھا مرے دل سے　　اُجالا دفعتاً پیدا ہو جیسے ماہِ کامل سے

حقیقت کی تجلی نے کیا ہے روح کو روشن　　مری ہستی نظر آتی ہے آگے حدِ باطل سے

فریبِ زندگی سے اب مجھے نسبت نہیں کوئی
نکل آیا ہوں آگے ہستیٔ فانی کی منزل سے

حقیقت کی طلب کرتی رہی بیحد حزیں مجھکو　　ملی تسکیں کہیں مجھکو، نہ چین آیا کہیں مجھکو

حیات و موت کی تھی کشمکش اور روح گریاں تھی　　حقیقت خود ہی آئی دیکھ کر اندوہگیں مجھکو

اب اپنی روح سے اکثر کیا کرتا ہوں یوں باتیں
کہ جیسے ہستیٔ فانی سے مطلب ہی نہیں مجھکو

نبی احمد دبریلوی

مطالبات

نگاہِ محبت فزا چاہتا ہوں　　مسافر ہوں اک رہنما چاہتا ہوں

تجلی نظر آشنا چاہتا ہوں　　تجھے جلوہ گر دیکھنا چاہتا ہوں

ابھی خام ہے کچھ، مذاقِ تمنا　　کرم ہائے صبر آزما چاہتا ہوں

مجھے کوئی کافر مسلمان کر دے　　مجازِ حقیقت ادا چاہتا ہوں

دلا دے کوئی یاد، بھولا ہوں کسکو　　بتا دے کوئی، ہائے کیا چاہتا ہوں

خریدار ہے کون دنیا میں دل کا　　کہاں اور کیا بیچنا چاہتا ہوں

خطا پر ندامت خطا در خطا ہے　　خطا کرکے دادِ خطا چاہتا ہوں

کیا ہے محبت نے گستاخ کتنا　　کہ تجھ سے تجھے مانگنا چاہتا ہوں

ہوس چاہتی ہے تجلیٔ عریاں　　مگر میں نگاہِ رسا چاہتا ہوں

جو قیدِ مجاز و حقیقت اٹھا دے　　وہ کیفیتِ دل کشا چاہتا ہوں

تمنائے دل اور محدود! کوکب
مقامِ ورا، الورا چاہتا ہوں

کوکب (شاہجہانپوری)

آیندہ جنوری ۳۵ء کے رسالہ نگار کیلئے

مخصوص علمی و ادبی دعوت

مکرمی - تسلیم -

یہ حقیقت غالباً جناب سے مخفی نہ ہوگی کہ گزشتہ چند سال سے نگار کا جنوری نمبر کسی نہ کسی مخصوص موضوع کے لئے وقف ہوتا ہے چنانچہ اسوقت تک مومن نمبر ظفر نمبر اور غالب نمبر شایع ہو کر ملک میں کافی مقبول ہو چکے ہیں جنوری ۱۹۳۵ء کے نگار کو میں لکھنؤ اور دلی کی شاعری کی تنقید کے لئے وقف کرنا چاہتا ہوں - اور متمنی ہوں کہ آپ بھی تھوڑا سا وقت نکالکر اس خدمت میں میری اعانت فرمائیے - اور اگر زحمت نہ ہو تو ابھی سے مطلع فرما دیجئے - کہ آپ کس موضوع پر اپنا مقالہ عنایت فرمائیں گے - اسی کے ساتھ یہ بھی استدعا ہے کہ اپنے افکار عالیہ کے ہمراہ اپنا فوٹو (یا بلاک اگر ہو تو وہ) مرحمت فرمائیں تاکہ مقالہ کے ساتھ وہ بھی شایع کیا جائے - آپ کے ایماء کے بعد آپ کا اسم گرامی عام اطلاع کے لئے نگار میں شایع کر دیا جائے گا

ذیل میں مختلف مباحث کی فہرست آپ کو نظر آئے گی، لیکن اگر موضوع سے متعلق آپ کسی اور مسئلہ پر تحریر فرمانا چاہیں تو آپ کو اختیار کلّی حاصل ہے، لیکن بہتر ہو اگر عنوان سے آپ آگاہ فرما دیں --- یہ ضروری نہیں کہ مضمون طویل ہو، لیکن جتنا ہو آپکے بہترین لمحات فرصت کا نتیجۂ فکر ہونا چاہیے

خاکسار

نیاز فتحپوری

عنوانات جن پر مقالے درکار ہیں

(۱) دہلی اور لکھنؤ اسکول کی شاعری پر مورخانہ نظر اور انکی خصوصیات
(۲) دونوں اسکولوں کے اکابر اور ان کا فرق مدارج
(۳) فن اور زبان کی حیثیت سے دونوں کا مرتبہ
(۴) لکھنؤ اسکول پر دہلی کا اثر
(۵) دہلی اسکول پر لکھنؤ کا اثر
(۶) دونوں اسکولوں کی غزلگوئی پر تفصیلی تبصرہ
(۷) لکھنؤ اسکول کے تین بہترین شاعروں کے ۲۰، ۲۰ شعر
(۸) دہلی اسکول کے تین بہترین شاعروں کے ۲۰، ۲۰ شعر
(۹) منظوم افسانے یا مثنوی لکھنؤ اسکول میں
(۱۰) منظوم افسانے یا مثنوی دہلی اسکول میں
(۱۱) دکن اور اردو شاعری (اسوقت تک تمام ادوار پر تبصرہ)
(۱۲) پنجاب اور اردو شاعری (اسوقت تک تمام ادوار پر تبصرہ)
(۱۳) تذکرہ نگاری کی حیثیت سے لکھنؤ اور دہلی کے خدمات
(۱۴) دونوں اسکولوں کے کارنامے، رباعیات، مرثیہ، قصیدہ و نعت میں
(۱۵) دولت مغلیہ کے انحطاط کا اثر دہلی کی شاعری پر
(۱۶) شاہان اودھ اور لکھنوی شاعری
(۱۷) دہلی اور لکھنوی شاعری میں اخلاقی و مذہبی عنصر
(۱۸) شاعری۔ لحاظ سے لکھنؤ کا دور زریں
(۱۹) شاعری کے لحاظ سے دہلی کا دور زریں
(۲۰) لکھنؤ اسکول کا سب سے پہلا شاعر جسنے دہلی کا تتبع کیا
(۲۱) دہلی اسکول کا سب سے پہلا شاعر جس نے لکھنؤ کا تتبع کیا
(۲۲) لکھنؤ اور دہلی کے وہ شعراء جنھوں نے ملک و قوم کو کوئی خاص پیغام پہنچایا
(۲۳) کیا دہلی اسکول روبہ انحطاط ہے اور کیوں
(۲۴) کیا لکھنؤ اسکول روبہ انحطاط ہے؟ اور کیوں
(۲۵) رام پور کا تعلق دہلی اور لکھنؤ اسکولوں سے
(۲۶) حیدرآباد اور لکھنؤ و دہلی اسکول کا اس سے تعلق
(۲۷) کیا لکھنؤ اسکول نے کلکتہ میں بھی شاعری کو متاثر کیا؟
(۲۸) کیا لکھنؤ اسکول میں اصلاح کی ضرورت ہے؟ اگر ہے تو کیا
(۲۹) کیا دہلی اسکول میں اصلاح کی ضرورت ہے؟ اگر ہے تو کیا
(۳۰) مستقبل میں آپ کو اردو شاعری سے کیا توقعات ہیں؟
(۳۱) دونوں اسکولوں کے وہ شعراء جنھوں نے قدامت کو ترک کرکے کسی ابداع و اختراع سے کام لیا
(۳۲) لکھنؤ اور دہلی کے ریختی باز ہزل گو
(۳۳) لکھنؤ اور دہلی کی خواتین جنھوں نے شاعری میں نمایاں حصہ لیا
(۳۴) لکھنؤ اسکول کے مختلف ادوار اور ہر دور کے بہترین شاعر
(۳۵) دہلی اسکول کے مختلف ادوار اور ہر دور کے بہترین شاعر
(۳۶) آگرہ اور دہلی کا شاعرانہ تعلق

نوٹ :۔ لکھنؤ اور دہلی کی شاعری سے مراد وہ تمام شعراء ہیں۔ جو یہاں کی شاعری سے متاثر ہو کر اسی رنگ میں شعر کہتے ہیں اس کے لئے کسی خاص جگہ کا باشندہ ہونے کی شرط نہیں ہے

خواتین کے مطالعہ کی کتابیں

گودڑ کا لال	عہ	فرائض مادری	۱۲ر
شوکت آرا بیگم حصہ ۱ و ۲	ے	افسانۂ نادر جہاں	عہ ۸ر
" حصہ سوم	ے	اقبال دلہن	عہ ۸ر
سعیدہ کے خطوط	عہ ر	حسن معاشرت	عہ ۲ر
پیاری سہیلی	۱۰ر	اباجی	عہ ۲ر
نئی نویلی پیاری سہیلی	عہ ۲ر	سولہ کہانیاں	۱۲ر
عورتوں کی انشاء	عہ ر	ستر کہانیاں	۱۲ر
انشاء نسواں	۸ر	سولہ قصے	۸ر
سیرۃ الکبریٰ	عہ ۲ر	مراۃ العروس	۸ر
دو زندگی حصہ ۱ و ۲	عا ر	بنات النعش	۸ر
محدرات تیموریہ	عا ر	توبۃ النصوح	۱۲ر
ازواج النبی	۱۲ر	کنیز فاطمہ	۸ر
ازواج الانبیاء	عہ ۸ر	پنکھڑیاں	۸ر
سیرۃ عائشہ صدیقہ	عا ۱۰ر	نصیحت کا کرن پھول	۸ر
عفت المسلمات	عہ ۸ر	برکات سلطانی	۸ر
سبیل الجنان	عا ر	ابن الوقت	عہ ۸ر
بچوں کی پرورش	عہ ۲ر	چند پند	۲ر
حرز طفلاں	عہ ر	منتخب الحکایات	۲ر
تہذیب نسواں	عہ ر	تندرستی	عہ ر
بیوی کی تعلیم	عہ ۲ر	حفظ صحت	عہ ر
بیوی کی تربیت	عہ	طبیب نسواں	عہ ر
تربیت اطفال	۱۲ر	رہبر صحت	۸ر

ناول، ڈرامے اور افسانے

قطرات اشک	عہ ۸ر	سوہنی	۱۲ر
چندر ناتھ	عہ ر	وداع ظفر	عہ ۸ر
بس کا روگ	عہ ر	یاسمین شام	عہ ۸ر
فسانۂ سعید	۸ر	طوفان اشک	عہ
خوفناک گیتی	عہ ۲ر	شاہین و دراج	۸ر
سیلاب اشک با تصویر	عہ ۲ر	درس عشق	عہ ۸ر
بے زبان دوست	۶ر	کروڑ پتی چور	عہ ۲ر
جمال ہم نشیں	عہ ر	تین بندوق باز	عہ ۸ر
تفسیر عصمت	عہ ر	کرشمۂ رقابت	۸ر
جوہر قدامت	عہ ر	انقلاب قسطنطنیہ	۸ر
تائید غیبی	۸ر	شاہد رعنا	عہ ۸ر
پر اسرار قتل	عا ر	ویمپا کی سرگزشت	۲ر
اعلان آزادی	۵ر	شگوفۂ محبت	۶ر
سرگزشت ہاجرہ	۱۰ر	نسوانی زندگی	۸ر
نوحہ زندگی	۱۲ر	ولایتی نخچی	۸ر
قلب حزیں	۸ر	شمع خاموش	۸ر
عروس کربلا	عہ ۸ر	شب زندگی کامل	عا ر
شہید مغرب	عہ ر	سودودہ	۸ر
ماہ عجم	عہ ۲ر	چندر کلا	۸ر
تیغ کمال	عہ ۸ر	گلستان خاتون	عہ ۲ر
سراب مغرب	۸ر	صبح زندگی	عہ ۸ر
منازل السائرہ کامل	عا ر	شام زندگی	عہ ر

تاریخ و سوانح عمریاں

تاریخ مغرب	عا ۸ر
مختصر تاریخ اسلامی	۸ر
" " حصہ ۲	۹ر
" " حصہ ۳	۱۰ر
" " حصہ ۴	عہ ر
الصالحات	عہ ۸ر
امت کی مائیں	عہ ر
الزہرا	۱۲ر
اسوۂ حسنہ	۸ر
ہندو شعراء	عہ ۲ر
شوق بہار	عہ ۸ر
سوانح اکبر الہ آبادی	عہ ر
سفرنامہ عراق	عہ ر
تاریخ افاغنہ	عہ ۸ر
اسلام اور غیر مسلم	۹ر
سیر المصنفین حصہ ۱	عا ر
" حصہ ۲	ے
تاریخ اسلام ۵ جلد	صہ
اخبار الاندلس ۴ جلد	عا ر
خلافت موحدین	للعہ
خلافت مولدین	عا ۸ر
عرب اور اسکا مستقبل	عہ

لغات و ادب

بازاری زبان	۸ر
لغات سعیدی	للعہ
لغات کشوری	ے ر
گنجینۂ تحقیق مجلد	للعہ
سبز اللغات فارسی	عا ر
محاورات نسوان	۸ر
جواہر اللغات	۱۲ر
گوہر اللغات	۱۲ر
چراغ سخن	عہ
دکھنی لغت	۸ر
جواہرات کلیات نظیر	عہ ۸ر
عزیز اللغات	عا ۸ر
تذکرۂ ریختی	عہ
تاریخ اردوئے قدیم	عہ ۲ر
دکن میں اردو	عا
منتخب کلام ہندی	عا ۸ر
رباعیات عمر خیام	عا
منتخب کلام ہندی	عا ۸ر
اردو کے اسالیب بیان	عا ۸ر
تصریح الاغلاط	۲ر
تلفظ اردو	۵ر
نور اللغات ۴ جلد	للعہ

دواوین فارسی

دیوان شمس تبریز	عہ ۲ر	کلیات غالب	عہ ۸ر	دیوان غنی کشمیری	۶ر
کلیات عراقی	۱۲ر	کلیات صائب	عہ ۱۲ر	دیوان ہلالی	۶ر
دیوان حافظ	عہ ر	دیوان ناصر علی	۶ر	اسرار خودی و رموز بے خودی	ے ر
دیوان بیدل	عہ ۱۲ر	کلیات سعدی	عہ ۸ر	زبور عجم	ے ۸ر
دیوان عرفی	۱۲ر	کلیات حزیں	عہ ۱۲ر	پیام مشرق	ے ۸ر
کلیات جامی	عا ر	دیوان عنصری	۱۲ر	قصائد عزیز مجلد	ے ۸ر

دواوین اُردو

کلیات ظفر	عا ر	کلیات نظیر اکبرآبادی	عہ ر	سخنخانۂ عشق	عا ر
کلیات مومن	عہ ۱۲ر	گلزار داغ	عہ ۲ر	فریاد داغ	عہ ۲ر
دیوان ناسخ	عہ ۲ر	دیوان درد	۱۲ر	عالم خیال با تصویر	عہ
کلیات میر	عہ ۸ر	دیوان ذوق	۱۲ر	دیوان شہیدی	۲ر
کلیات سودا	عہ ۸ر	گلکدہ عزیز	عہ ر	کلیات اکبر الہ آبادی	للعہ
کلیات انشاء	عہ ۸ر	مراۃ الغیب	عہ	[illegible]	عہ

رجسٹرڈ نمبر اے ۱۱۰۴

ذیل کی کتابیں نگار بک ایجنسی سے طلب فرمایئے

رجسٹرڈ نمبر اے ۱۱۰۴

تذکرہ و تاریخ

- پیغمبر اعظم ۸ر
- شب معراج عہ
- سراج منیر عہ
- پیغمبر عالم ۸ر
- سوانح حضرت رسول عہ
- سید المرسلین ۸ر
- حیدر کرار ۸ر
- سیرۃ الصدیق ۶ر
- عمر ابن خطاب ۸ر
- ابوبکر صدیق عہ
- ائمہ اسلام ۱۲ر
- الحبیب ۶ر
- عمر بن عبد العزیز ۸ر
- دولت غار و غیرہ ۶ر
- مکمل سوانح زیب النسا بیگم عہ
- تذکرہ اولیا ۶ر
- تذکرہ اولیائے ہند للعہ
- مرآۃ الکونین ۶ر
- قصص الانبیا کامل ۱۲ر
- سفرنامہ چین ۶ر
- تلخیص التواریخ عہ
- خاتون جنت ۶ر
- مختارات الصوفیہ عہ
- خواتین انگورہ عہ
- مشاہیر نسواں عہ
- مشاہیر ہند ۶ر
- مخدرات انگورہ ۶ر
- بیگمات بنگال ۶ر

جاسوسی کی ناول

- شرلاک ہومز ۶ر
- محاصرہ پیرس ۸ر
- شیخ چلی ۴ر
- بہرام کی واپسی ۴ر
- انقلاب فرانس عہ
- بحری قزاق عہ
- فطرتی جاسوس ۸ر
- ترکی حرم سرا ۸ر
- جنگ طرابلس ۴ر
- بہرام چور ۱۲ر
- زر پرست ۱۲ر
- کنجی کا راز ۸ر
- عبدالرحمن ناصر عہ
- عروس مصر ۶ر
- سیلاب خون ۸ر
- سیاحت زمین ۸ر
- سیاحت ہوا عہ
- نازنین مراکش ۸ر
- سمندر کی سیر ۶ر
- اسرار الشویزم ۸ر
- روح بیلی ۷ر
- مین ہمک ۱۲ر
- حجاج بن یوسف ۸ر
- یوسف پاشا ۸ر
- انقلاب عثمانی ۸ر
- بہرام کی رہائی ۸ر
- بہرام کی آزادی ۸ر
- بہرام کی سرگزشت ۸ر

مراثی

- مراثی دبیر ۶ر
- مراثی انیس کامل للعہ
- مراثی ضمیر عہ
- مراثی مونس ۱۲ر
- مراثی دلگیر ۱۲ر

عجائب و غرائب

- عجائب مخلوقات، تصویر رنگین ۱۲ر
- جلا تصویر سادہ نلعہ
- مجمع الفنون ۸ر
- طلسم فرنگ ۶ر
- کارخانۂ عالم عہ

رنالڈز کے ناولوں کے ترجمے

- الوین و لیلی ۸ر
- فریب حسن ۶ر
- سوزن عشق ۸ر
- روز نامہ بمبرٹ ۸ر
- ناول اسرار ۶ر
- شام جوانی ۸ر
- حرم سرا ۷ر

ناول [illegible] حسین

- احمق الذی ۸ر
- حاجی بغلول ۸ر
- پیاری دنیا ۸ر
- کایا پلٹ ۸ر
- میٹھی چھری ۹ر
- طرحدار لونڈی عہ
- طلسمی فانوس ۱۲ر

ناول جوالا پرشاد

- مرزا النی ۱۰ر
- مار آستین ۱۰ر
- بنگالی دولہن ۱۲ر
- معشوقہ فرنگ ۸ر
- پرتاب ۱۲ر
- رودھنی ۱۰ر

ناول سرشار

- سیر کہسار ۸ر
- خدائی فوجدار ۶ر
- جام سرشار ۸ر
- الف لیلہ بطرز ناول للعہ
- کامنی ۸ر
- سوانح عمر عیار ۸ر

ظفر عمر بی اے

- بوروں کا کلب ۹ر
- نیلی چھتری ۸ر
- بہرام کی گرفتاری عہ

ادبی کتابیں

- مکمل شرح دیوان غالب ے
- بزم خیال عہ
- نشاط سخن عہ
- مکاتیب محسن الملک ۸ر

تذکرۃ الشعراء

- تذکرہ حسینی ۱۲ر
- گلشن بہار ۱۰ر
- سراپائے سخن عہ
- سوانح نظیر اکبرآبادی ۶ر

ناول شرر

- جنید بغدادی عہ
- مخدرات ۸ر
- عجائب ہائے حق للعہ
- نعمت حسین عہ
- فاتح و مفتوح ۸ر
- بابک خرمی ۸ر
- ایام عرب ۶ر
- قیس و لبنیٰ ۸ر
- یوسف و نجمہ ۸ر
- زوال بغداد ۸ر
- حسن کا ڈاکو ۸ر
- دربار حرام پور ۱۰ر
- مینا بازار عہ
- مقدس نازنین ۸ر
- رومۃ الکبریٰ ۸ر
- فلپانا ۸ر
- شوقین ملکہ ۸ر

مولانا شبلی نعمانی

- سیرۃ النبی جلد اول صہ
- سیرۃ النبی جلد دوم للعہ
- سیرۃ النبی جلد سوم ے
- الفاروق ے
- الغزالی ۸ر
- المامون ۸ر
- رسائل شبلی ۸ر
- موازنۂ انیس و دبیر ے
- کلام شبلی اردو ۸ر
- الکلام ۸ر
- علم الکلام ۸ر
- شعرالعجم جلد اول ۶ر
- شعرالعجم جلد دوم ۶ر
- شعرالعجم جلد سوم ۶ر
- شعرالعجم جلد چہارم ۸ر
- شعرالعجم جلد پنجم ۸ر

نگار بک ایجنسی لکھنؤ